جلد ۸۴ — نومبر ۱۹۷۵ء — عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۴	نومبر ۱۹۷۵ء مطابق شوال ۱۳۹۵ھ	عدد ۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

زرسالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ذرا چشمِ تصور کھول کر انسانیت کی خوش بختی کا اس حال میں جائزہ لیجیے اگر بعد میں آنے والی ہر نسل پیشرو نسل کی کوتاہیوں اور خامیوں کو سامنے رکھ کر پیہم اصلاحِ احوال کی کوشش کرتی چلی جاتی اور ان لغزشوں سے بچنے کے لیے سعی کرتی جو اس سے پہلی نسل سے سرزد ہوئی تھیں۔ کیا اس صورت میں اللہ کی یہ زمین اس دنیا میں جنت کا نقشہ پیش نہ کرتی؟ اسے نوعِ بشری کی تیرہ بختی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہر دور کا انسان اپنی ایجادات اور اکتشافات میں، اپنے صنعتی اور فنی کمالات میں یا دوسرے لفظوں میں مادی ترقی کے مختلف شعبوں میں اپنے پیشروؤں کی کاوشوں سے بھرپور فائدہ اُٹھاتا ہے اور اُن کی کامرانیوں اور ناکامیوں کو نگاہ میں رکھ کر اپنی جدوجہد کے لیے ایسے خطوط متعین کرتا ہے جن سے اس کے قدم آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں لیکن وہی انسان جب اخلاقی اور معاشرتی دائرے میں سرگرمِ عمل ہوتا ہے تو ماضی کے سارے تجربات یکسر فراموش کر کے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے کام کا آغاز کرتا ہے۔ تاریخ کی کوئی اچھی سی کتاب لے کر گزری ہوئی اقوام کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کا شاید سب سے بڑا المیہ ہی یہی ہے کہ ہر آنے والی نسل اس بات کا تہیہ کر کے اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے کہ اسے مذہب، اخلاق اور معاشرتی زندگی میں اپنے پیشروؤں سے قطعاً کوئی سبق حاصل نہیں کرنا بلکہ جن گمراہیوں میں وہ گرفتار ہوئے ہیں اُن میں اُسے لازمی طور پر اپنے آپ کو گرفتار کرنا ہے، جو ٹھوکریں انہوں نے کھائی ہیں وہ بہر طور اسے بھی کھانی ہیں اور ضلالت و گمراہی کے جن مہیب غاروں میں وہ گرے ہیں اُن میں بہر حال اسے بھی گرنا ہے۔ نیکی اور بھلائی، ہمت اور ایثار، جفاکشی اور جذبۂ تعاون میں اگر اس کے قدم گزرے ہوئے لوگوں سے پیچھے رہ جائیں تو اسے اس بات کا کوئی غم نہیں مگر اُسے یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہیں کہ خدا فراموشی، دنیا پرستی، بداخلاقی، مکروفریب الغرض وہ سارے معائب جو انسانیت کو بلندی کی طرف نہیں بلکہ پستی کی طرف لیجانے والے ہیں، اُن میں وہ اپنے پیشروؤں سے کسی طرح پیچھے رہ جائے۔

انسانیت کے اس حوصلہ شکن طرزِ عمل نے بحیثیت مجموعی انسان کو انتہائی پریشان اور مایوس کر دیا ہے۔ وہ ایک طرف یہ دیکھتا ہے کہ انسان پہلے کی نسبت زیادہ مالدار اور مادی وسائل کے اعتبار سے زیادہ آسودہ حال ہے۔ برق و بخارات سے کام لے کر اُس نے اشیاء کی پیداوار میں محیر العقول اضافہ کیا ہے اور ان کی مدد ہی سے اس نے دُنیا کے دُور دراز گوشے سمیٹ کر کرۂ ارضی کو ایک مختصر سی اکائی بنا کر رکھ دیا ہے اور اب اس کی تنگ دامانی سے نکل کر افلاک کی بے پایاں وسعتوں کو اپنے تصرف میں لانے کے درپے ہے۔ اس کی کامرانی اور ظفر مندی کا ایک یہ رُخ ہے مگر دوسری طرف اس کی زبوں حالی کا یہ عالم ہے کہ برق رفتاری کے ساتھ ہوا میں اُڑنے والا انسان جو چند ساعتوں کے اندر زمین کے مدار سے بآسانی باہر نکل کر چاند کی طرف کامیابی سے پرواز کر سکتا ہے وہ کسی ایسی بُرائی کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتا جو پہلی نسلوں میں کسی صورت میں موجود تھی۔ اگر گزری ہوئی قوموں میں فرعون اور نمرود کی صورت میں خدا کے باغی پیدا ہوئے تو آج بلا مبالغہ انسانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد فرعون اور نمرود کا طرزِ عمل اختیار کیے ہوئے ہے اور ان کی نسبت زیادہ ڈھٹائی کے ساتھ خدا سے بغاوت کی روش اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ اگر ماضی میں ظلم و استبداد، زبردست آزاری اور اخلاقی حدود و قیود کو پامال کرنے کی وجہ سے مختلف قومیں تباہ ہوئیں تو آج بھی انہی برائیوں کی وجہ سے قومیں ہلاکت کا شکار ہو رہی ہیں۔ لیکن نہ تو فرعون اور نمرود کا حشر دیکھ کر آجکل کے فراعنہ اور نمارِدہ کو کوئی سبق حاصل ہوتا ہے اور نہ ظالم بستیوں کے حسرتناک انجام سے آجکل کی سفاک قومیں کوئی عبرت پکڑتی ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ لوہے کی ہر نئی مشین پہلی مشینوں سے بہتر اور ان کے نقائص سے پاک ہوتی ہے۔ لیکن "مٹی کی مشین" میں وہ سارے عیوب بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں جو سابقہ مشینوں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھے۔ کیا یہ صورتِ حال اس حقیقت کی شہادت نہیں دیتی کہ انسان ماضی کے واقعات سے سبق سیکھنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا۔

انسانیت کی اس دلفگار داستان کو دیکھتے ہوئے ذہن میں قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان کی اس ناکامی اور نامرادی کا سبب کیا ہے؟ اس کے یوں تو متعدد وجوہ ہیں مگر چار خاص طور پر بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ جنہیں اگر ایک فقرہ میں سمیٹ کر بیان کرنا مقصود ہو تو "اُسے اقتدار کی بدمستی کہا جا سکتا ہے"۔

یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ زندگی کے ہر مرحلہ پر اثباتِ ذات کے لیے کوشش کرتا ہے اور اس کی یہ کوشش انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی۔ اگر وہ اس راہ میں سعی و جہد ترک کر دے تو پھر اس کی

زندگی بالکل عبث اور بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس اثبات ذات میں وہ جہاں اپنے لیے ایک خاص مقام کے حصول کا حق منواتا ہے وہاں وہ اپنے فکر و عمل سے یہ بات بھی ثابت کرتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں پر تفوق اور برتری حاصل ہے۔ انسان کا یہ فطری داعیہ اگر اپنی مناسب حدود میں رہے اور ہر فرد تعمیری کوششوں اور اخلاق حسنہ کی بنا پر دوسرے انسان پر سبقت لے جانے کی کوشش کرے تو اس سے انسانیت کو بحیثیت مجموعی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور قدرت نے انسان کے اندر یہ جذبہ مسابقت اسی وجہ سے ودیعت کر رکھا ہے کہ اس سے اثباتِ ذات میں مدد ملتی ہے۔ لیکن انسان اس معقول اور تعمیری راستے کو چھوڑ کر غیر معقول، جابرانہ اور تخریبی راستوں سے دوسرے افراد پر تسلّط حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور اس کا ایک عام اور سہل طریقہ یہ ہے کہ کسی طرح تخت اقتدار پر قبضہ حاصل کر لیا جائے اور پھر اقتدار کی قوت سے اپنی خدائی کا جھوٹا سکّہ چلا کر اپنی بھپری ہوئی انا کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے۔ یہ طریقہ اس لیے سب سے زیادہ آسان ہے کہ اس میں مکر و فریب اور اندھی بہری قوت کے علاوہ اور کوئی چیز صرف نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص روحانی اور اخلاقی مصلح کے طور پر دوسرے انسانوں میں نمایاں ہونے کا آرزومند ہو تو اسے اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت زیادہ ریاضت کرنا پڑتی ہے اور پھر اس مقام کو حاصل کر لینے کے بعد اس پر فائز رہنے کے لیے اسے اپنے اخلاق کا ایک خاص معیار برقرار رکھنے کی غرض سے تزکیہ نفس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن سیاسی قوت کے حصول کے لیے اصلاح نفس کے لیے قطعاً کوئی کوشش درکار نہیں ہوتی بلکہ کوئی انسان جس قدر زیادہ بگڑا ہوا ہو اور دھوکہ دہی کے فن میں جس نسبت سے بیباک اور مشّاق ہو اسی نسبت سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ ماضی میں جب بادشاہت وراثت کے طور پر ایک ہی خاندان میں ایک فرد سے دوسرے فرد کی طرف منتقل ہوتی رہتی تھی اور معاشرے کے عام افراد کے لیے تخت اقتدار پر متمکن ہونا امرِ محال خیال کیا جاتا تھا تو اقتدار کے پجاری صرف یہی کچھ کر سکتے تھے کہ مختلف حیلوں بہانوں سے شاہ کے مصاحبین بن جائیں۔ جمہوریت کے اس دور میں چونکہ ہر ذہین آدمی اقتدار پر قابض ہو سکتا ہے اس لیے وہ بڑی جسارت کے ساتھ دلفریب نعروں، جھوٹے وعدوں، کذب اور دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے اور عوام کے جذبات سے کھیلتے ہوئے اُن کی گردنوں پر مسلط ہو جاتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ جو اقتدار ناپاک عزائم کی تکمیل کی خاطر ناپاک ذرائع سے حاصل ہو، اس پر قابض رہنے کے لیے بھی ناپاک ہتھکنڈے ہی استعمال کرنے پڑتے ہیں چنانچہ جھوٹ کے جس مذموم دھندے سے حصولِ اقتدار کی

جد وجہد شروع ہوتی ہے وہ کاروبار تخت اقتدار پر متمکن ہوجانے کے بعد کہیں زیادہ تیز ہوجاتا ہے اور اس کی ضرورت خاص طور پر اس لیے بھی پیش آتی ہے کہ جب تک ایک انسان اقتدار سے محروم رہتا ہے اسے یہ رعایت بہرحال حاصل ہوتی ہے کہ عوام اس کے خوش کن دعوؤں کے متعلق کسی قدر حسن ظن سے کام لیں اور نیک تمنائیں وابستہ کرتے ہوئے اُس کے تسلط کو ملک اور قوم کے لیے اچھا شگون خیال کریں لیکن بلند بانگ دعوے کرنے والا وہی شخص جب عملاً مسندِ اقتدار پر براجمان ہوکر ملک کے سیاہ وسپید کا مالک بنتا ہے تو پھر اس کی آزمائش کا دور شروع ہوتا ہے اور اسے اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے دعاوی میں کس حد تک مخلص اور سچا ہے۔ اُس کے یہ دعاوی چونکہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کا مقصد لوگوں کو فریب دینا ہوتا ہے اس لیے مسندِ اقتدار پر متمکن ہوتے ہی اس کی توجہ اس بات پر مبذول ہوجاتی ہے کہ وہ قوم کو دھوکے میں رکھ کر اس پر ایک طویل عرصے تک بلا شرکت غیرے مسلط رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت کے وسیع ذرائع ابلاغ کو کام میں لاتے ہوئے جھوٹ کی ایک نہایت منظم مہم کا آغاز ہوتا ہے، سرکاری اخبارات، ریڈیو اور ٹیلیویژن اور آقائے ولی نعمت کے دوسرے ثنا خواں، حکمرانوں خصوصاً اُس کے مرکزی کردار کے ایسے کارہائے نمایاں بیان کرتے ہیں جن سے عام تاثر یہی ملتا ہے کہ قوم کے سارے دکھوں کا بڑی تیزی کے ساتھ مداوا ہو رہا ہے، ملک سے افلاس مٹ رہا ہے، ظلم واستبداد دم توڑ رہا ہے، ناانصافیوں اور دراز دستیوں کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے اور جو لوگ ان جرائم کا ارتکاب کر رہے تھے وہ کیفر کردار کو پہنچنے والے ہیں۔ حکومت اگرچہ اس قسم کے جھوٹے پراپیگنڈے پر کروڑوں روپے سالانہ صرف کرتی ہے مگر نتائج کے اعتبار سے یہ کسی طرح بھی مفید ثابت نہیں ہوتا بلکہ عوام کے اندر اس کے خلاف ایک شدید ردّعمل پیدا ہوتا ہے اور وہ اس نہج پر سوچنا شروع کردیتے ہیں کہ حکومت اپنی ناکامیوں کو مکر وفریب کے ذریعے چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کسی فرد یا گروہ کے تخت نشین ہونے سے پیشتر تو لوگ اس کے دعاوی کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار ہوسکتے ہیں مگر عنانِ اختیار سنبھالنے کے بعد صحیح صورتِ حال کو محض الفاظ کی بازیگری سے چھپایا نہیں جاسکتا۔ چند افراد یا کسی گروہ کو تھوڑے سے وقت کے لیے دھوکہ دینا ممکن ہے لیکن پوری قوم کو ایک لمبے عرصہ تک بیوقوف بنانا امر محال ہے۔ سخت ناداں ہیں وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ غربت اور افلاس کے شدائد اور سیاسی استبداد اور معاشی استحصال کے مصائب کو محض پراپیگنڈے کے ذریعہ مٹایا جاسکتا ہے۔ زندگی ایک ٹھوس حقیقت ہے اور یہ اپنے مسائل کے حل کے لیے ٹھوس اقدام کی ہی طالب ہوتی ہے اس لیے جو لوگ ٹھوس حقائق کا سامنا کرنے کے بجائے صرف الفاظ کی شعبدہ بازیوں اور دلفریب بیانات کی بھرمار سے عوام کو

اپنے دامِ فریب میں گرفتار رکھنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں انھیں جلد ہی اپنا انجام نظر آنے لگتا ہے مگر اقتدار کا نشہ اور اپنے غلط کار مشیروں کے غلط مشورے اور گرد و پیش میں کاسہ لیسوں کا ہجوم انھیں راہ راست پر آنے نہیں دیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہدِ اقتدار کو طول دینے کی غرض سے ہر اس آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں جو انھیں آنکھیں کھول کر حکومت چلانے کی دعوت دیتی ہے۔ فرمانرواؤں کا مزاج اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ وہ اختلاف کی کوئی معمولی آواز سننا بھی گوارا نہیں کرتے اور ملک میں بزعمِ خود ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں جس میں یا تو صرف اُن کی آواز گونجے یا پھر وہ آواز جس میں ان کی تعریف و توصیف کا رس گھلا ہو مگر زبان بندی کے یہ سارے حربے آج تک کسی صورت بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ نہ ماضی میں نہ حال میں کیونکہ یہ حربے اس نظامِ عدل کے خلاف ہیں جس پر یہ ساری کائنات قائم ہے۔ کوئی ظالم حکمران زبانوں پر تو پہرے بٹھا سکتا ہے لیکن وہ زخمی دلوں کی آہ و فغاں کو کس طرح دبا سکتا ہے۔ وہ پولیس کی مدد سے اس بات کا التزام تو کر سکتا ہے کہ لوگ سڑکوں پر نکل کر نالہ و فریاد کرنے سے گریز کریں مگر وہ نالے جو دل کے اندر شورش بپا کرنے والے اور آنکھوں سے ابل کر عوام کے کرب و اضطراب کو ظاہر کرنے والے ہیں اُن کے اثرات کو آخر کس طرح زائل کیا جا سکتا ہے۔ یہ عاقبت نااندیش حکمران ہمیشہ اس غلط فہمی کا شکار رہے ہیں کہ لوگوں کی زبانوں پر اگر قدغن عائد کر دی جائے تو تخت و تاج اُن کی میراث بن سکتے ہیں۔ وہ شاید اقتدار کی مستی میں یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ بسا اوقات "خاموش گویائی" بالخصوص جب وہ محرومیوں کی المناک داستان سنا رہی ہو اور مجبوری اور بے بسی کی حسرتناک تصویر پیش کر رہی ہو، لمبی چوڑی تقریروں، خوشنما بیانات سے کہیں زیادہ اثر انگیز ثابت ہوتی ہے اور پوری قوم کے خفتہ احساسات کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ٹھوس حقیقت آمرانہ مزاج کے حامل فرمانرواؤں کی نظر سے ہمیشہ اوجھل رہی رہی ہے اور وہ اپنی اس غفلت کی وجہ سے خود اپنے آگے بھی کانٹے بوتے ہیں اور ملک و ملت کو بھی ہر دور میں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتے ہیں۔

تلخ حقائق کو نظر انداز کرنے سے اُن کی تلخی میں تو کوئی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ اُن کا سامنا کرنے میں جس قدر تغافل برتا جاتا ہے اُسی نسبت سے اُن کی سنگینی بڑھتی چلی جاتی ہے اور حکمرانوں کی پیہم غلطیوں کی وجہ سے یہی حقائق لاینحل مسائل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک فرمانروا اپنی آمریت کے قیام کی خاطر عوام کے جائز شہری حقوق سلب کرتا ہے۔ اس ناانصافی کا جو ردِعمل عوام کے اندر ہوتا ہے وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن خود اس حکمران کو اپنی

اس ظالمانہ کارروائی کی تائید کے لیے سخت ناقابلِ اعتماد سہاروں سے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ جو فرد یا گروہ کسی لالچ میں آکر پوری دنیا کے سامنے ناحق بات کی تائید کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے اور اس معاملے میں خدا اور خلق دونوں کے سامنے صریح جھوٹ بولتا ہے وہ کسی حکمران کے لیے کس حد تک مفید ثابت ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ جو فرد اپنے آپ سے مخلص نہ ہو، جسے اپنے ضمیر اور ایمان کے خلاف بات کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہ ہوتی ہو، جو معمولی سے دنیوی فائدوں کے لیے ظلم کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو سکتا ہو اُسے آخر کس طرح بھروسے کے قابل سمجھا جا سکتا ہے اور جو شخص اس پر بھروسہ کرتا ہے کیا وہ اپنی بربادی کا سامان فراہم نہیں کرتا؟ ظالم حکمران جادۂ مستقیم سے ہٹ کر عوام پر جس نسبت سے دستِ ظلم دراز کرتے ہیں اسی نسبت سے وہ معاشرے کے بے ضمیر افراد کی تائید کے محتاج ہوتے ہیں تاکہ وہ ستمرانیوں کے حق میں کوئی آواز سن سکیں۔ یہ اندوہناک صورتِ حال جب کچھ مدت تک جاری رہتی ہے تو عملاً حکمران ٹولے میں وہ لوگ باقی رہ جاتے ہیں جو ضمیر، ایمان، حق پرستی اور اصول پسندی کی دولت سے محروم ہوتے ہیں اور صرف مادی مفادات کی خاطر تختِ اقتدار پر براجمان شخص سے اپنی عقیدت اور وابستگی کا اعلان کرتے پھرتے ہیں۔ یہ فریب خوردہ شخصیت کچھ عرصہ تک تو اس بات سے مسرور ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ "عقیدت مندوں" اور "جاں نثاروں" کی فوج ظفر موج موجود ہے مگر چند ماہ کے بعد ہی اسے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے یہ "فدائین" اس کے لیے کس طرح وبالِ جان بنتے جا رہے ہیں۔ حکومت خواہ کتنے ہی وسیع ذرائع و وسائل کی مالک ہو مگر وہ اقتدار کے سارے "خیرخواہوں" کی ہر آن بڑھتی ہوئی خواہشات کو کماحقہ پورا نہیں کر سکتی۔ خصوصاً جب ان میں سے ہر "جاں نثار" مطالبات کی ایک طویل فہرست جیب میں لیے پھرتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سربراہِ مملکت کے پرستار مطلوبہ مفادات حاصل نہ ہونے کی وجہ سے آہستہ آہستہ اس کا ساتھ چھوڑ کر مخالف کیمپوں میں جا گھستے ہیں وہ چونکہ مملکت اور صاحبِ اقتدار اور اس کے یمین و یسار میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے اس کے محرمِ راز ہوتے ہیں اس لیے وہ حکومت کے ایوانوں میں بڑی تیزی کے ساتھ زلزلہ پیدا کر سکتے ہیں۔ حکمران طبقہ ان مخدوش حالات میں بھی سوچ سے کام نہیں لیتا بلکہ وہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ وابستگانِ اقتدار میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے کچھ دوسرے "جاں نثاروں" سے پُر کیا جائے۔ اس نازک مرحلے پر جب اقتدار کا سنگھاسن ڈول رہا ہو وہی لوگ لپک کر اسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھتے ہیں جنہیں دنیوی مفادات کے علاوہ اس بات کی بھی فکر لاحق ہوتی ہے کہ اگر انہوں نے حکومت کا تحفظ حاصل نہ کیا تو اُن کے لیے آزادی کے ساتھ عوام کے اندر گھومنا پھرنا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ تعزیرات

سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو حکومت کا بھی خواہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن حکمرانوں کی فرمانروائی اس قسم کے آبرو باختہ لوگوں کی تائید کی محتاج ہو وہ آخر کتنے دن قائم رہ سکتی ہے اور وہ جتنے دن قائم رہے اس میں ملک وملت کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کر سکتی ہے۔ اس نوعیت کی حکمرانی تو ایک عذاب ہے جس کی لپیٹ میں حاکم و محکوم دونوں آجاتے ہیں۔ تاریخ کا ہر ورق اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے مگر ہر ظالم حکمران اس سے اغماض برتتا ہے۔

اقتدار کا دوسرا المیہ نوعیت کے اعتبار سے خدا اور آخرت سے غافل اس فاسق و فاجر کے طرز عمل سے ملتا جلتا ہے جو ہر روز اپنے سامنے لوگوں کے جنازے اُٹھتے دیکھتا ہے مگر اس کا کوئی اثر قبول نہیں کرتا، جو خود اپنے ہاتھوں سے اپنے بھائی بندوں کو لحد میں اُتار کر انہیں منوں مٹی کے نیچے دباتا ہے مگر ان کی موت سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتا۔ وہ غالباً یہ سمجھ کر فسق و فجور میں مبتلا رہتا ہے کہ موت تو دوسرے لوگوں کا مقدر ہے اس کا مقدر نہیں۔ اسے ابدالآباد تک اس دنیا پر ہی رہنا ہے اور اس کے اس حق کو کوئی طاقت چھین نہیں سکتی۔ انسان کی غفلت کوشی کا سب سے دردانگیز پہلو یہ ہے کہ وہ ہر اس حقیقت کو جس کا وہ صبح و شام مشاہدہ کرتا ہے اور جو اس کے سب سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے اس پر سب سے زیادہ مؤثر طریق سے اثرانداز ہوتی ہے اس سے ہی صرف نظر کرتا ہے۔ انسانی زندگی میں موت سے زیادہ محسوس اور واضح حقیقت اور کونسی ہو سکتی ہے جس کے انکار کی کوئی شخص جرأت نہیں کر سکتا لیکن انسان اس حقیقت کو ماننے کے باوجود اسے عملاً جھٹلاتا ہے۔ اگر کوئی فرد دل کی گہرائیوں میں یہ بات تسلیم کرے کہ اُسے ایک دن موت کی آغوش میں پناہ لینا ہے اور اس سے مفر نہیں تو وہ اپنے خدا سے غافل ہو کر فسق و فجور کی زندگی بسر کرنے کی کیونکر جرأت کر سکتا ہے مگر لوگ اپنے حتمی انجام کو جاننے کے باوجود اپنے مالک سے بغاوت کا رویہ اس غلط فہمی کا شکار ہونے کی وجہ سے کرتے ہیں کہ موت سے دوسرے لوگوں کو ہی دوچار ہونا ہے، وہ اس کی گرفت میں کسی طرح نہیں آسکتے۔

بالکل یہی حال بگڑے ہوئے حکمران کا ہوتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اقتدار کی بے ثباتی دیکھتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو بخوبی جانتا ہے کہ جو شخص پہلے اس مسند اقتدار پر فائز تھا جس پر اب وہ قابض ہے، وہ اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں کس قسم کی خوش فہمیوں کا شکار تھا اور بالآخر اُس کا کیا (باقی بر صفحہ ۴۵)

فصل ششم

عالمگیر اُمّتِ مُسلمہ کی تاسیس

(۴)

اُمّتِ مسلمہ کی حقیقی حیثیت | اِس طرح جو جماعت وجود میں آئی تھی وہ کسی معنی میں بھی ایک "قوم" نہ تھی۔ اُس کی حقیقی حیثیت کو اُن الفاظ سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے جو قرآن اور حدیث میں اُس کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔

حِزب | ایک لفظ حزب ہے جو قرآن مجید میں دو جگہ مسلمانوں کے لیے استعمال ہوا ہے (المائدہ - آیت ۵۶ - المجادلہ آیت ۲۲)، اور یہ بعینہٖ پارٹی کا ہم معنی ہے۔ دونوں جگہ مسلمانوں کو حِزبُ اللہ (اللہ کی پارٹی کے لوگ) کہا گیا ہے، یعنی اُس پارٹی کے لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے کام کے لیے وقف کر دیا ہے۔ قومیں نسل و نسب کی بنیاد پر اُٹھتی ہیں اور پارٹیاں اصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اِس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں۔ کیونکہ اِن کو تمام دنیا سے الگ اور ایک دوسرے سے وابستہ صرف اِس بنیاد پر کیا گیا ہے کہ یہ ایک اصول اور مسلک کے معتقد اور پیرو ہیں، اور جن لوگوں سے اِن کا اصول و مسلک میں اشتراک نہیں ہے وہ خواہ اِن سے قریب ترین خونی اور مادّی رشتے ہی کیوں نہ رکھتے ہوں، اُن کے ساتھ اِن کا کوئی میل نہیں ہے۔

قرآن روئے زمین کی اِس پوری آبادی میں صرف دو ہی پارٹیاں دیکھتا ہے۔ ایک اللہ کی پارٹی (حِزبُ اللہ)۔ دوسری شیطان کی پارٹی (حِزبُ الشیطان)۔ شیطان کی پارٹی میں خواہ باہم اصول و مسلک کے اعتبار سے کتنے ہی اختلافات ہوں، قرآن ان سب کو ایک سمجھتا ہے، کیونکہ ان کا طریقِ فکر اور طریقِ عمل بہر حال اسلام نہیں ہے اور جزئی اختلافات کے باوجود بہر حال وہ سب شیطان کے اتباع پر متفق ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۔ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۔ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۔ (المجادلہ-۱۹)

"شیطان اُن پر مسلط ہو چکا ہے اور اُس نے خدا کی یاد اُن کے دل سے بھلا دی ہے۔ وہ شیطان کی پارٹی کے

لوگ ہیں۔ خبردار رہو، شیطان کی پارٹی والے ہی خسارے میں رہنے والے ہیں"

برعکس اس کے اللہ کی پارٹی والے خواہ نسل اور وطن، رنگ اور زبان اور تاریخی روایات کے اعتبار سے باہم کتنے ہی مختلف ہوں، بلکہ چاہے اُن کے آباؤ اجداد میں باہم خونی عداوتیں ہی کیوں نہ رہ چکی ہوں جب وہ خدا کے بتائے ہوئے طریق فکر اور مسلکِ حیات میں متفق ہو گئے تو گویا الٰہی رشتے (حَبْلُ اللہ) سے باہم جڑ گئے اور اس نئی پارٹی میں داخل ہوتے ہی ان کے تمام تعلقات حزبُ الشیطان والوں سے کٹ گئے۔

اُمّت دوسرا لفظ جو مسلمانوں کے لیے پارٹی ہی کے معنی میں قرآن نے چار جگہ (البقرہ - ۱۲۸ - ۱۴۳ - آل عمران ۱۰۴ - ۱۱۰) استعمال کیا ہے وہ لفظ اُمّت ہے۔ حدیث میں بھی یہ لفظ کثرت سے مستعمل ہوا ہے۔ اُمّت اُس جماعت کو کہتے ہیں جس کو کسی امرِ جامع نے مجتمع کیا ہو۔ جن افراد کے درمیان کوئی اصلِ مشترک ہو اُن کو اُسی اصل کے لحاظ سے "اُمّت" کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک زمانے کے لوگ بھی "اُمّت" کہے جاتے ہیں۔ ایک نسل یا ایک ملک کے لوگ بھی "اُمّت" کہے جاتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کو جس اصلِ مشترک کی بنا پر اُمّت کہا گیا ہے وہ نسل یا وطن یا معاشی اغراض وغیرہ نہیں ہیں بلکہ وہ اُن کی زندگی کا مشن اور اُن کی پارٹی کا اُصول اور مسلک ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران - ۱۱۰)۔

"تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔ بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو"

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا - (بقرہ - ۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی اُمّت بنایا ہے تاکہ تم نوعِ انسانی پر نگراں ہو اور رسول تم پر نگراں ہو"

اِن آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "مسلمان" دراصل ایک بین الاقوامی پارٹی کا نام ہے۔ دنیا کی ساری قوموں میں سے اُن اشخاص کو چھانٹ کر نکالا گیا ہے جو ایک خاص اُصول کو ماننے، ایک خاص پروگرام کو عمل میں لانے اور ایک مشن کو انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ لوگ چونکہ ہر قوم میں سے نکلے ہیں اور ایک پارٹی بن جانے کے بعد کسی قوم سے بھی اِن کا تعلق نہیں رہا ہے، اس لیے یہ بیچ کی اُمّت ہیں۔ لیکن ہر ہر قوم سے تعلق توڑنے کے بعد سب قوموں سے اِن کا ایک دوسرا تعلق قائم کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ دنیا میں خدائی فوجدار کے فرائض انجام

دیں۔ "تم نوعِ انسانی پر نگراں ہو" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ مسلمان خدا کی طرف سے دنیا میں فوجدار مقرر کیا گیا ہے اور "نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے" کا فقرہ صاف کہہ رہا ہے کہ مسلمان کا مشن ایک عالمگیر مشن ہے۔ اس مشن کا خلاصہ یہ ہے کہ "حزب اللہ" کے رہنما سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فکر و عمل کا جو ضابطہ خدا نے دیا تھا اس کو تمام ذہنی، اخلاقی اور مادی طاقتوں سے کام لے کر دنیا میں نافذ کیا جائے، اور اس کے مقابلہ میں دوسرے ہر طریقے کو مغلوب کر دیا جائے۔ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۔ یہ ہے وہ چیز جس کی بنیاد پر مسلمان ایک امت بنائے گئے ہیں۔

جماعت تیسرا اصطلاحی لفظ جو مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت ظاہر کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت استعمال کیا ہے وہ لفظ جماعت ہے، اور یہ لفظ بھی "حزب" کی طرح بالکل پارٹی کا ہم معنی ہے۔ عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ اور يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ اور ایسی ہی بکثرت احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ "قوم" یا "شعب" یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ استعمال کرنے سے قصداً احتراز فرمایا اور ان کے بجائے "جماعت" ہی کی اصطلاح استعمال کی۔ آپ نے کبھی یہ نہ فرمایا کہ "ہمیشہ قوم کے ساتھ رہو" ——— یا "قوم پر خدا کا ہاتھ ہے"۔ بلکہ ایسے تمام مواقع پر آپ جماعت ہی کا لفظ استعمال فرماتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے اور یہی ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماع کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے "قوم" کے بجائے "امت"، "جماعت"، "حزب" (پارٹی) کے الفاظ ہی زیادہ مناسب ہیں۔ قوم کا لفظ جن معنوں میں عموماً مستعمل ہوتا ہے ان کے لحاظ سے ایک شخص خواہ وہ کسی مسلک اور کسی اصول کا پیرو ہو، ایک قوم میں شامل رہ سکتا ہے جبکہ وہ اس قوم میں پیدا ہوا ہو اور اپنے نام، طرزِ زندگی اور معاشرتی تعلقات کے اعتبار سے اس قوم کے ساتھ منسلک ہو۔ لیکن امت، جماعت، حزب اور پارٹی کے الفاظ جن معنوں میں مستعمل ہوتے ہیں ان کے لحاظ سے اصول اور مسلک ہی پر پارٹی میں شامل ہونے یا اس سے خارج ہونے کا مدار ہوتا ہے۔

اصولی جماعت اور قومی جماعت کا فرق اب ایک جماعت تو وہ ہوتی ہے جس کے پیشِ نظر ایک قوم یا ملک کے مخصوص حالات کے لحاظ سے سیاسی تدبیر کا ایک خاص نظریہ اور پروگرام ہوتا ہے۔ اس قسم کی جماعت محض ایک سیاسی پارٹی ہوتی ہے اس لیے وہ اس قوم کا جزو بن کر کام کر سکتی ہے اور کرتی ہے جس میں وہ پیدا ہوتی ہو۔

دوسری جماعت وہ ہوتی ہے جو ایک کلی نظریہ اور جہانی تصور (WORLD IDEA) لے کر اٹھتی ہے، جس کے پاس تمام نوعِ انسانی کے لیے بلا لحاظِ قوم و وطن ایک عالمگیر مسلک ہوتا ہے، جو پوری زندگی کی تشکیل و تعمیر ایک خاص ڈھنگ سے کرنا چاہتی ہے، جس کا نظریہ و مسلک عقائد و افکار اور اصولِ اخلاق سے لے کر انفرادی

بڑھاؤ اور اجتماعی نظام کی تفصیلات تک ہر چیز کو اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، جو ایک مستقل تہذیب (CULTURE) اور ایک مخصوص تمدّن (CIVILIZATION) کو وجود میں لانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ جماعت بھی اگرچہ ہوتی ایک جماعت ہی ہے، لیکن یہ اُس قسم کی جماعت نہیں ہوتی جو کسی قوم کا جزء بن کر کام کر سکتی ہو۔ یہ محدود قومیتوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس کا تو مشن ہی یہ ہوتا ہے کہ اُن تمام تعصبات کو توڑ ڈالے جن سے دنیا میں نسل، رنگ، زبان، وطن اور روایات کی بنیاد پر مختلف قومیتیں بنی ہیں۔ یہ اپنے آپ کو ان قومیتوں کے ساتھ کیسے وابستہ کر سکتی ہے؟ یہ تو نسلی و تاریخی قومیتوں کے بجائے ایک عقلی قومیت (RATIONAL NATIONALITY) بناتی ہے۔ جامد قومیتوں کی جگہ ایک نامی قومیت (EXPANDING NATIONALITY) بناتی ہے۔ یہ خود ایک ایسی قومیت بنتی ہے جو فکری و تہذیبی وحدت کی بنیاد پر روئے زمین کی پوری آبادی کو اپنے دائرے میں لینے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ لیکن اس معنی میں ایک قومیت بننے کے باوجود حقیقت میں یہ ایک جماعت ہی رہتی ہے، کیونکہ اس میں شامل ہونے کا مدار اتّفاقی پیدائش پر نہیں ہوتا بلکہ اُس خاص نظریہ و مسلک کی شعوری پیروی پر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر یہ جماعت بنتی ہے۔

مسلمان دراصل اسی دوسری قسم کی جماعت کا نام ہے۔ یہ اُس قسم کی پارٹی نہیں ہے جیسی پارٹیاں ایک قوم میں بنا کرتی ہیں۔ بلکہ یہ اس قسم کی پارٹی ہے جو ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی اور ایک مستقل نظامِ تہذیب و تمدّن بنانے کے لیے اُٹھتی ہے اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی تنگ سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر ایک بڑی جہانی قومیت (WORLD NATIONALITY) بنانا چاہتی ہے۔ اس کو "قوم" کہنا اس لحاظ سے تو درست ہوگا کہ یہ اپنے آپ کو دنیا کی نسلی یا تاریخی قومیتوں میں سے کسی قومیت کے ساتھ بھی باعتبار جذبات وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی بلکہ اپنے نظریۂ حیات (VIEW OF LIFE) اور فلسفۂ اجتماع (SOCIAL PHILOSOPHY) کے مطابق خود اپنی تہذیب کی عمارت الگ بناتی ہے۔ لیکن اس معنی کے لحاظ سے ایک الگ "قوم" ہونے کے باوجود حقیقت میں یہ "جماعت" ہی رہتی ہے کیونکہ محض اتفاقی پیدائش (MERE ACCIDENT OF BIRTH) کسی شخص کو اس کا ممبر نہیں بنا سکتی جب تک کہ وہ اِس کے مسلک کا معتقد اور پیرو نہ ہو۔ اور اسی طرح کسی شخص کا کسی دوسری قوم میں پیدا ہونا اس امر میں مانع بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی قوم سے نکل کر اِس قوم میں داخل ہو جائے جب کہ وہ اس کے مسلک پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو۔ پس جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں کی قومیت اُن کے ایک جماعت یا پارٹی ہونے ہی کی بنا پر قائم ہے۔ جماعتی حیثیت جز کا حکم رکھتی ہے

اور قومی حیثیت اس کی فرع ہے۔ اگر جماعتی حیثیت کو اس سے الگ کر لیا جائے اور یہ محض ایک "قوم" بن کر رہ جائے تو یہ دراصل مسلمان ہونے کی حیثیت سے اِس کے وجود کی نفی ہے۔

خلاصۂ بحث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں اُمتِ مسلمہ کی یہ جداگانہ تنظیم، اور ایک مستقل معاشرے کی حیثیت سے اس کی تاسیس، اور غیر مسلم معاشرے سے اُس کی قطعی علیٰحدگی اگرچہ یکلخت نہیں بلکہ بتدریج کئی سال میں ہوئی۔ لیکن دعوتِ اسلامی کا آغاز جس ڈھنگ پر ہوا تھا، اُس سے لوگوں نے ابتدا ہی میں یہ بھانپ لیا تھا کہ یہ تحریک کس رُخ پر جا رہی ہے اور آخر کار یہ کیا رنگ لائے گی۔ اس لیے پُرانے جاہلی معاشرے کو جو لوگ بھی باقی رکھنا چاہتے تھے وہ سب اِس پر بھڑک اُٹھے اور اپنے درمیان سے اِس نئی اُمت کے اُبھرنے کو روکنے کے لیے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

فصل ہفتم

نبی اور غیر نبی کے کام کا فرق

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ جو کچھ اب تک کہا جا چکا ہے اس پر ایک مجموعی نظر ڈال لی جائے، کیونکہ یہاں پہنچ کر ایک نبی اور غیر نبی کی قیادت اور اس کے طریقِ کار کا فرق اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عرب میں اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے اُس وقت دنیا میں بھی، اور خود آپ کے اپنے ملک میں بھی بے شمار اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ روم اور ایران کے سامراج بھی انتہائی جابرانہ شان کے ساتھ موجود تھے۔ نسلی اور طبقاتی امتیازات بھی شدت کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ کمزوروں پر زبردستوں کا ظلم بھی بے تحاشا جاری تھا۔ ہر طرح کا ناجائز معاشی استحصال بھی ہو رہا تھا۔ بدترین اخلاقی برائیاں بھی پھیلی ہوئی تھیں، حتّٰی کہ عبادت خانے تک فواحش کے اڈّے بنے ہوئے تھے۔ عرب ان سب ملکوں سے زیادہ پیچیدہ مسائل سے دوچار تھا جو ایک لیڈر کے ناخنِ تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ملک میں رہنے والی اور ایک ہی زبان بولنے والی قوم، جس کے اندر نسل و نسب کے باہمی رشتے بھی موجود تھے، بیشمار قبائل میں بٹی ہوئی تھی۔ اُس کے اندر "عرب قوم" کا تصور سرے سے ناپید تھا۔ لوگ اپنے قبیلے ہی کو اپنی قوم

سمجھتے اور کہتے تھے - ملک میں ہر طرف طوائف الملوکی، خانہ جنگی، بدامنی، جہالت، اخلاقی پستی، ظلم و ستم، بھوک اور افلاس کا دور دورہ تھا - بیرونی طاقتیں عرب کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ملک کے اندر گھسی چلی آرہی تھیں - شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رُومی تسلُّط پہنچ چکا تھا اور رومی قیصریت اندرون ملک میں روپیہ اور مشنری پھیلا کر اپنے اثرات کو وسعت دے رہی تھی - مغربی ساحل کے عین مقابل حَبَش کی عیسائی سلطنت مدتوں یمن پر حملے اور قبضے کرتی رہی، حتیٰ کہ ایک مرتبہ مکہ تک بھی اس کی فوجیں پہنچ گئیں - ایران عرب کے مشرقی ساحل اور کچھ اندرونی علاقوں پر تو اپنا تسلط جما ہی چکا تھا، بعد میں یمن تک بھی اس کا اقتدار پہنچ گیا - حجاز میں اکثر و بیشتر زرخیز حصوں پر باہر سے آئے ہوئے یہودی صدیوں سے قابض تھے اور اپنی سود خواری کے جال میں انہوں نے عربوں کو پھانس رکھا تھا -

اِس حالت میں اگر کوئی مصلح قسم کا لیڈر عرب سے اُٹھتا تو وہ اپنے کام کا آغاز یا تو جاہلانہ رسموں، اخلاقی خرابیوں اور آپس کی خانہ جنگیوں کو روکنے کی کوششوں سے کرتا - یا پھر امیری و غریبی کا مسئلہ اٹھا کر غریبوں کو امیروں سے بھڑا دیتا، تاکہ عام لوگوں کی بھوک مٹے اور افلاس دُور ہو - اور اگر کوئی سیاسی قسم کا لیڈر اُٹھتا تو وہ عربوں کو یہ لالچ دے کر اپنے پیچھے لگانے کی کوشش کرتا کہ میں تم کو ایک طاقتور قوم بناؤں گا، بیرونی غاصبوں کو نکال باہر کروں گا، عرب کو ایک بڑی سلطنت بنا دوں گا، تمہاری تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ دوں گا، تمہارے وسائلِ معیشت بڑھا دوں گا، تمہاری بھوک مٹاؤں گا اور طاقت حاصل کر کے گردو پیش کے ممالک پر تاخت کروں گا، تاکہ تم پر دولت کی بارش ہو - اس سارے کام میں اخلاق کا کوئی سوال درمیان میں نہ آتا، اور وہ اپنی سیاسی قیادت کو کامیاب بنانے کے لیے کسی چال، کسی جوڑ توڑ، کسی ہتھکنڈے، کسی زور زبردستی، اور کسی کُشت و خون سے کام لینے میں ذرا تأمّل نہ کرتا - پھر بنیادی طور پر دونوں قسم کے لیڈروں کی قیادت ایک قوم پرستانہ قیادت ہوتی - اپنے قبیلے کی عصبیت سے وہ بہت اُونچے اُٹھتے بھی تو زیادہ سے زیادہ عربی عصبیت تک پہنچ جاتے - دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں تک اُن کی نظر پھیلتی بھی تو عربی مفاد کے لیے پھیلتی، "انسانیت" کے وسیع تر تصور تک اُس کی رسائی محال تھی -

اسلامی تحریک کا مخصوص طریق کار اب ذرا اللہ کے بھیجے ہوئے رسول، صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے - حالات اور مسائل وہی سب کچھ تھے جو اُوپر بیان ہوئے ہیں، اور وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ اہم تھے جنہیں بالکل ناقابلِ توجہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا - حضورؐ نے بھی ان کو ناقابلِ توجہ نہیں سمجھا - وقت آنے پر اُن میں سے ایک ایک کو آپ نے

حل ہی نہیں کیا بلکہ وہ انقلاب عظیم برپا کر کے دکھا دیا جس کا کوئی غیر نبی مُصلح یا سیاسی لیڈر تصور تک نہ کر سکتا تھا۔ لیکن آپ نے اپنے کام کے آغاز میں ان سب سے قطعی صرفِ نظر فرما کر اپنی پوری توجہ صرف ایک بنیادی اصلاح پر مرکوز کر دی جو انسانی زندگی کے سارے مسائل کو حل کرنے کی ایک ہی کلید تھی - اگرچہ آپ ایک قبیلے اور ایک شہر میں پیدا ہوئے تھے، لیکن اسلامی تحریک کے پہلے روز ہی سے آپ کے پیشِ نظر نہ قبیلہ تھا، نہ قوم، نہ ملک نہ وطن، بلکہ پوری نوعِ انسانی پر آپ کی نگاہ تھی جس کو آپ ایک صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دینے کے لیے اُٹھے تھے، اور سب مسائل کو چھوڑ کر جس بنیادی اصلاح پر آپ نے اپنی کوششیں مرکوز کر دی تھیں وہ یہ تھی کہ:

۱- لوگ توحید پر ایمان لائیں سب کی بندگی چھوڑ کر صرف اللہ کی بندگی اختیار کریں اور اسی کے حکم کو واجب الاتباع قانون مانیں-

۲- محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانیں اور اُس ہدایت، تعلیم اور آئین و قانون کی اطاعت کریں جو اللہ کی طرف سے اُن کے ذریعہ پہنچے - رسولؐ پر اس ایمان سے خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ بھی مستثنیٰ نہ تھے، کجا کہ کوئی اور ہو سکتا-

۳- قرآن کو اللہ کا کلام مانیں اور اس کے فرمان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واجب الاذعان تسلیم کریں-

۴- آخرت پر ایمان لائیں اور یہ سمجھتے ہوئے دنیا میں کام کریں کہ آخر کار مرنے کے بعد ہمیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے-

۵- اخلاقی حسن و قبح کے اُن ناقابلِ تغیّر اصولوں کی پیروی اختیار کریں جو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب نے پیش کیے ہیں-

۶- انسانوں میں سے جو لوگ بھی اِس دعوت کو قبول کر لیں وہ ایک ایسی اُمّت بن جائیں جو اِس دعوت کی علمبردار بن کر اُٹھے، اِس کو غالب کرنے کے لیے جان و مال کی بازی لگا دینے پر تیار ہو جائے، آپس میں پوری طرح متحد ہو، اور اپنا ایک مستقل معاشرہ بنا کر کفر اور کفار سے قلبی محبت اور عملی معاشرت کے تعلقات توڑ لے-

اس طریقِ کار کی اہمیت

ابتدا میں سب طرف سے نظر پھیر کر صرف اِس ایک بنیادی اصلاح پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ اوّل تو یہ تھی کہ یہی امرِ حق ہے اور رسول کا اصل کام حق ہی پیش کرنا ہے - دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدّنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی اصل علّت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار و غیر ذمہ دار سمجھنا، اور آپ اپنا اِلٰہ بن جانا یا اِلٰہ العالمین کے سوا کسی

دوسرے کو خدائی اوصاف و اختیارات یا حقوق کا حامل تسلیم کرنا ہے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ خرابی جب تک جڑ میں موجود رہے اسلامی نظریہ کی رُو سے کوئی اُوپری اصلاح انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دُور کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دُور کیا جائے گا تو کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لے گی۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز اگر ہوسکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہوسکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری وغیر جواب دہی کی ہوا نکال دی جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ (SOVEREIGN) موجود ہے اور تُو اُس کی پیدائشی رعیت (BORN SUBJECT) ہے۔ اُس کی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹائے مٹ سکتی ہے اور نہ تو اُس کے حدودِ سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اس اَمِٹ اور اَٹل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اُوپر عائد ہوگا۔ حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ تو سیدھی طرح اُس کے آگے سر جھکا دے اور بندۂ مطیع (مسلم) بن کر رہے۔ دوسری طرف اُس کو حقیقت کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اِس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختارِ کل ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ درحقیقت کسی کا حکم چلتا ہے۔ اس لیے تُو اُس کے سوا کسی کا بندہ نہ بن، کسی کا حکم نہ مان، کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی ہز میجسٹی نہیں ہے۔ میجسٹی اُسی ایک کے لیے مختص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے۔ ہولی نس ساری کی ساری اُسی کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہائی نس نہیں ہے۔ ہائی نس صرف اُسی ایک کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈ شپ نہیں ہے۔ لارڈ شپ بالکلیہ اُسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز نہیں ہے۔ قانون اُسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حقدار و سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی اَن داتا، کوئی شاہ وشہنشاہ، کوئی ولی وکارساز، کوئی مشکل کشا، کوئی دعائیں سُننے والا اور کوئی فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری اور فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں۔ رب اور مولیٰ صرف ایک ہے۔ لہٰذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کردے اور اُسی ایک کا غلام، مطیع اور پابندِ حکم بن جا۔

یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھیڑ کر از سرِ نو ایک خاص نقشے پر بنتی ہے۔ اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدم سے لے کر اب تک

پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے، اِسی بنیاد پر ایک نئے طریقے سے حل ہوتے ہیں۔

حضورؐ کی دعوت کا طریقِ آغاز

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہِ راست پیش کر دیا۔ انہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا کہ پہلے کچھ سیاسی اور سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اُس اثر سے کام لے کر رفتہ رفتہ کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کر لیے جائیں، پھر اُن اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اِس مقام تک بڑھا لائیں۔ یہ سب کچھ، کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اُٹھا اور چھوٹتے ہی اس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کا اعلان کر دیا۔ اس سے کم کسی چیز پر اس کی نگاہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ ٹھیری۔ اِس کی وجہ محض پیغمبرانہ جرأت اور تبلیغی جوش ہی نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار یہی ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے، اِس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتا۔ جو لوگ لا اِلٰہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آدمی کا ساتھ دیتے رہے ہوں وہ اِس بنیاد پر تعمیرِ جدید کرنے میں اُس کے کسی کام نہیں آ سکتے۔ اِس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو بُلانے والے کی طرف لا الٰہ الا اللہ کی آواز سُن کر ہی آئیں، اِسی چیز میں اُن کے لیے کشش ہو، اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں، اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اُٹھیں۔ لہٰذا اسلامی تحریک چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبّر اور حکمتِ عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز توحید کی دعوت ہی سے کیا جائے۔

توحید کے تصور کی وسعت

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ اِس سے انفرادی و اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری یا غیر اللہ کی حاکمیت و اُلوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر ایک نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا مؤذنوں کو اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کی صدا بلند کرتے ہوئے اِس لیے ٹھنڈے پیٹوں سُن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ میں کیا پکار رہا ہوں نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد موجود الوقت پورے نظام سے بغاوت اور اس کی جگہ ایک دوسرا نظام تعمیر کرنا ہے تو یقین جانیے کہ اِس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آ جائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔

اس طریقِ کار کی کامیابی کے اسباب

یہی صورت اُس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے علانیہ یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا، اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اس لیے جس جس پر جس پہلو سے بھی

اِس پکار کی ضرب پڑتی تھی، وہ اِس آواز کو دبانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں اور پروہتوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوّق کا، رسم پرستوں کو اپنی رسوم کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقے کا، غرض ہر بُت کے پرستار کو اپنے بُت کے لُوٹنے کا خطرہ اِسی ایک آواز میں محسوس ہوا۔ اس لیے الکفر ملۃٌ واحدۃ کے مصداق وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اِس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے۔ اِس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا۔ جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے۔ جن کے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اُس کی خاطر آگ میں کُودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اِس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک، دو دو، چار چار کر کے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا، کسی کو گھر والوں نے نکال دیا، کسی کے عزیز، دوست، آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت، ریاست، غرض ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں۔ اِن کا آنا ضروری تھا۔ اِن کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ آگے بڑھ سکتی تھی۔

کام کے آدمی چھانٹنے اور اُنہیں تربیت دینے کا فطری طریقہ

اِن کا لازمی فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے، کمزور سیرت و کردار اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آ ہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسلِ آدم کا بہترین جوہر تھا جس کی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اِس کے سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اِس بھٹی میں سے گزر کر آئے۔ پھر جو لوگ آئے اُن کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے، یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ انہوں نے جو کچھ بھی سہا صرف حق اور صداقت کے لیے، خدا اور اس کی رضا کے لیے سہا۔ اسی کے لیے وہ پٹے۔ اِسی کے لیے وہ بھوکے مرے۔ اِسی کے لیے دنیا بھر کی جفاکاریوں کا تختۂ مشق بنے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی چلی گئی جس کی ضرورت تھی۔ اُن کے اندر مضبوط اور قابلِ اعتماد اسلامی کردار پیدا ہوا۔ اُن کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اِس زبردست تربیت گاہ میں کیفیتِ اسلامی کا طاری ہونا ایک فطری امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اُٹھتا ہے اور اُس کی خاطر کشمکش، جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید،

فاقہ، جلاوطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گزرتا ہے تو اِس ذاتی تجربے کی بدولت اُس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اُس کی پوری شخصیت اُسی مقصد میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اِس چیز کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے سب سے پہلے نماز اُن پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی کا ہر امکان دُور ہوجائے۔ اپنے نصب العین پر اُن کی نگاہ جمی رہے۔ جس کو وہ حاکم مان رہے ہیں اس کی حاکمیت کا بار بار اقرار کرکے اپنے عقیدے میں وہ مضبوط ہو جائیں جس کے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے۔ اُس کا عالِمُ الغیبِ والشّہادہ ہونا، اُس کا مالک یوم الدین ہونا، اُس کا قاہر فوقَ عبادِہ ہونا پوری طرح ان کے ذہن نشین ہوجائے، اور کسی حال میں اس کی اطاعت کے سوا دوسرے کسی کی اطاعت کا خیال تک ان کے دلوں میں نہ آئے۔

اسلامی دعوت کے پھیلنے کے وجوہ

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اِس طرح ہو رہی تھی، اور دوسری طرف اِسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند لوگ پیٹے جارہے ہیں، قید کیے جا رہے ہیں، گھروں سے نکالے جا رہے ہیں تو خواہ مخواہ ان کے اندر یہ معلوم کرنے کی جستجو پیدا ہوتی تھی کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب اُنہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین، کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی ان کی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اِس لیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت اِن پر منکشف ہوئی ہوئی ہے، تو اُن کے دلوں میں آپ سے آپ یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر وہ ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے یہ لوگ ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ اور اِس سے انسانی زندگی میں اِس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے، اور اِس دعوت کو لے کر ایسے لوگ اُٹھے ہیں جو محض صداقت، حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں، تو اُن کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اُن کے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوتے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے۔ اِس پس منظر میں یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز اُن لوگوں کے جن کو ذاتی وجاہت کے تکبّر، یا اجداد پرستی کی جہالت، یا اغراضِ دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا، اور سب لوگ اِس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی دیر تک اِس کشش کی مزاحمت کرتا رہا۔ مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند بے لوث آدمی کو اِس کی طرف کھنچنا ہی پڑا۔

حضورؐ کی سیرت کا غیر معمولی اثر

اِس دوران میں تحریک کے رہنما صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اُس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اُٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ اُن کی ہر بات، ہر فعل

اور ہر حرکت سے اسلام کی حقیقی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔

اُن کی بیوی حضرت خدیجہؓ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار خاتون تھیں اور وہ ان کے مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو اُن کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا۔ کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنالینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اِس تحریک کے پھیلانے میں چند سال کے اندر لٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب سنہ ۱۰ بعدِ نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا ملک التجار تھا اس کو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسّر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرتؐ کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنالیں گے۔ عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دے دیں گے۔ دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے۔ بشرطیکہ آپ اِس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اُٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

قریش کے اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سُنیں جب کہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، مفلس، معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے۔ اِنہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اُونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا، اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلے اور خاندان کسی کے مفاد کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ آپ کے لیے ایمان لانے والے غیر اپنے تھے، اور ایمان نہ لانے والے اپنے غیر تھے۔ اسی چیز نے دنیا کو آپ کی حق پرستی کا قائل کیا۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اُٹھے ہیں۔ اور اسی چیز نے آپ کی دعوت کی طرف ہر ملک اور ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو تو کسی طرح بچا لوں، تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اُٹھتے تو حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ، اور ایران کے سلمانؓ کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں آپ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی۔ ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔

سائنس اور وجودِ باری تعالیٰ پر ایمان

جناب ریاض الحسن نوری صاحب

آج کل بعض لوگوں نے جو اپنے آپ کو جدید اور قدیم دونوں علوم سے آراستہ سمجھتے ہیں، علمی مسائل میں یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ وہ اپنے مضامین یا گفتگو میں مغرب کے ایسے غیر معروف اور کم حیثیت منکرِ خدا فلسفیوں کا کچھ اس انداز میں تذکرہ کرتے ہیں گویا وہ کوئی بڑے عظیم مفکر ہوں اور ان کے اقوال سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ فلسفہ و سائنس کی نظر میں وجودِ باری ثابت نہیں ہے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ جدید دور کے تقریباً سارے ہی قابلِ ذکر فلسفی اور سائنس دان وجودِ باری تعالےٰ کو تسلیم کرتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے ان کا ذکر اپنی مشہور کتاب "فلسفہ مغرب کی تاریخ" میں کیا ہے۔ برٹرینڈ رسل دورِ حاضر کا ایک عظیم سائنس داں تھا۔

رسل نے لکھا ہے کہ ایک زمانے میں پادریوں نے سائنس کی شدید مخالفت کی تھی۔ وہ دور پادریوں کے جبر و تشدد کا دور تھا۔ انہوں نے مشہور سائنس دان گلیلیو پر سخت مظالم کیے، مگر اس کا خدا پر ایمان سائنسی انکشافات کی وجہ سے اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ وہ برابر ظلم سہتا رہا لیکن حمدِ الٰہی کے گیت گاتا رہا۔ بقول رسل گلیلیو زبردست مذہبی آدمی تھا۔ وہ کہتا تھا کہ خدا ہر آن اپنی نئی سے نئی شان سائنسی قوانین کی صورت میں ظاہر کرتا رہتا ہے، اور ہر سائنسداں اپنے علم کے ذریعے سے اللہ کے قوانینِ فطرت کو دیکھ کر اور ان کی معرفت حاصل کر کے پکا خدا پرست بن جاتا ہے۔

برٹرینڈ رسل کی رائے یہ ہے کہ نئے دور کے سارے سائنسدان نہ صرف خدا پرست ہیں بلکہ شرافت و بھلائی کے بھی اچھے نمونے ہیں۔ اب یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ جدید سائنس کی بنیاد مسلمان سائنسدانوں نے ہی رکھی تھی یہ مسلمان سائنسداں نہ صرف پختہ عقائد کے حامل تھے بلکہ طبعی علوم کے انکشافات کے سبب آیاتِ الٰہی کے گہرے مطالعہ کی مدد سے عشقِ الٰہی سے بھی سرشار تھے۔ یورپین سائنسدان، مسلمان سائنسدانوں کی دریافتوں کو اب

تک جو اپنی دریافتیں بنا کر مشہور کرتے رہے تھے اس کا پردہ بھی اب چاک ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح جدید سائنس میں بھی مسلمانوں کی دوڑائی ہوئی خدا پرستی کی روح موجود ہے۔ برٹرینڈ رسل کا دعویٰ ہے کہ نیوٹن اور اس کے دور کے سارے مغربی سائنسدان خدا کے وجود اور اس کے عظیم خلاق اور قانون ساز ہونے کے قائل تھے۔ نیوٹن کی رائے تھی کہ قانونِ ثقل اور دیگر قوانینِ قدرت جن کی دریافت سے سائنس نے ترقی پائی ہے یہ سب قوانین خدا کے بنائے ہوئے ہیں۔

برٹرینڈ رسل کی رائے ہے کہ فرانسس بیکن نے بھی عربوں کی سائنسی روایات کو ہی اپنے ہاں جاری رکھا۔ اس نے لکھا ہے کہ فرانسس بیکن، راجر بیکن اور ہابس یہ سب اپنے اپنے وقت میں پکے خدا پرست تھے۔

اسی طرح مشہور فلسفی اور سائنسدان، ڈیکارٹ بھی ایک پختہ اعتقاد خدا پرست سائنسدان تھا۔ اس نے وجود باری تعالیٰ کے حق میں زبردست سائنٹفک دلائل بھی فراہم کیے اور وجود باری تعالیٰ کو منطقی اور سائنسی طور پر ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اسی طرح کیپلر، اسپنوزا بھی خدا پرست تھے۔ اسپنوزا نے خدا کے وجود کے ثبوت میں علیحدہ دلائل فراہم کیے۔ اس کا قول ہے

"انسانی ذہن کی سب سے اعلیٰ خوبی یہ ہے کہ وہ معرفتِ الٰہی حاصل کرے اور اس کی سب سے بڑی نیکی بھی یہی ہے کہ وہ خدا کی معرفت کی جستجو کرے"۔

برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ مشہور سائنسدان لیبنز بھی راسخ العقیدہ خدا پرست تھا۔ اس نے خدا کے وجود کے لیے، بعد الطبیعیات کے اصولوں کو سامنے رکھ کر بہترین دلائل پیش کیے۔ اس نے ان میں کارلائل، بائرن اور نطشے وغیرہ کا مختصر ذکر بھی کیا ہے۔ کارلائل نے تو حضورؐ اکرم کی تعریف و توصیف میں وہ مشہور مضمون لکھا تھا جس کا عنوان "ہیرو پیغمبرؐ" تھا۔ بائرن اگرچہ بڑا کٹر اور متعصب شخص تھا لیکن خدا کو بہر حال مانتا تھا۔ اسی طرح فرینکلن جو ایک مشہور امریکن ماہرِ طبیعیات اور سیاست دان تھا اس نے آسمانی بجلی پر کام کر کے دنیا کو متحیر کر دیا تھا۔ اس نے امریکن فلاسوفیکل سوسائٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ بھی پختہ خدا پرست اور عقیدۂ آخرت اور حساب و کتاب کا قائل تھا۔ وہ اس زندگی کو خدا کا انعام اور احسان سمجھتا تھا۔ رسل کہتا ہے کہ جب فلسفہ کی سوسائٹی کی بنیاد رکھنے والے خود خدا اور آخرت دونوں کے قائل ہوں تو پھر فلسفہ کو مطعون کرنا انصاف نہیں ہے۔

ایک بہت بڑے یونانی فلسفی سقراط کو بھی زہر کا پیالہ پلایا جا رہا تھا تو اس نے ایتھنز کے لوگوں کو

مخاطب کر کے کہا تھا "اے ایتھنز کے لوگو میں تمہاری عزت کرتا ہوں اور تم سے محبت کرتا ہوں مگر جہاں تک حکم کی بجا آوری کا تعلق ہے میں تمہارا نہیں بلکہ صرف خدا کا حکم بجا لاؤں گا۔"

پاسکل فرانس کا ایک عظیم ریاضی دان، سائنسدان، اور فلاسفر تھا۔ اس کے علم و فضل پر تبصرہ کرتے ہوئے برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے " پاسکل نے اپنی ریاضی کی عظیم صلاحیت و ذہانت کو خدا پر قربان کر دیا، طبیعیات کے طالب علم پاسکل لاء سے خوب واقف ہیں"۔ پاسکل کا سوانح نگار لکھتا ہے " پاسکل نے ریاضی کی دنیا میں اس طرح قدم رکھا کہ اس نے بارہ سال کی عمر میں ہی خود اپنی جیومیٹری بنانے کی سعی کی۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے (مخروطی اشکال کی جیومیٹری) پر کتاب لکھی۔ لیکن پاسکل نے سائنسی تحقیقات زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رکھیں۔ وہ جلد ہی دنیاوی علائق سے کنارہ کش ہو کر یاد الٰہی میں مشغول ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے سائنسی تصنیفات کے علاوہ مذہب پر بھی کتابیں لکھیں"۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے " سیدھے سادھے عام لوگوں کو بغیر دلائل کے خدا پر پختہ ایمان رکھتے ہوئے دیکھ کر آپ حیران نہ ہوں۔ خدا ان میں اپنی محبت خود پیدا کرتا ہے۔ خدا ہی ان کے دلوں کو یقین کی طرف مائل کرتا ہے"۔

پاسکل کے بعد رسل نے لاک کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "لاک ایک راسخ العقیدہ پکا خدا پرست انسان تھا۔ لاک کو ڈیکارٹ کے دلائل بسلسلۂ اثباتِ وجود باری پسند تھے اور وہ ان کو کافی سمجھتا تھا۔ مشہور فلسفی کانٹ کا بھی یہ خیال تھا کہ چونکہ اس دنیا میں نیک لوگ بہت تکالیف اٹھاتے ہیں اس لیے اگلا جہان ہونا بہت ضروری ہے جہاں پورا انصاف کیا جائے گا۔ کانٹ اپنے دلائل کو ایسا پختہ خیال کرتا تھا کہ کوئی ان پر اب تک کوئی حرف نہیں لا سکا"۔

مشہور فلسفی اور خطیب برکلے آئرلینڈ کا رہنے والا تھا۔ وہ اتنا ذہین تھا کہ ۲۲ سال کی عمر میں ہی ٹرینٹی کالج کا فیلو بن گیا تھا۔ اس نے بھی خدا کی موجودگی کے بالکل نئے دلائل پیش کیے۔ اس کی خدا پرستی مضبوط دلائل پر قائم تھی۔

رسل نے ہیوم کی یہ رائے تحریر کی ہے کہ " تجربہ اور مشاہدہ سے انسان کچھ بھی نہیں سیکھ سکتا"۔ گویا ہیوم اس نظریے کا قائل نظر آتا ہے کہ علمِ وحی سے ہی انسان راہ ہدایت پا سکتا ہے۔ مجرد تجربہ اور مشاہدہ انسان کو تسکین نہیں پہنچاتا۔

یورپ میں رومانی تحریک کی ایک عظیم شخصیت روسو ہے جو ایک عظیم سیاسی مفکر ہے۔ اس نے ڈی جان اکیڈمی

کے مقرر کردہ عنوان "کیا آرٹ اور سائنس نے انسانیت کو فائدہ پہنچایا ہے؟" پر لکھا ہے کہ "ان دونوں نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا - فائدہ صرف مذہب نے پہنچایا ہے" چنانچہ اس نے انعام حاصل کر لیا، یہاں تک کہ اس نے خدا کو ثابت کرنے کے جو دلائل پیش کیے ان کو عیسائیوں کے پروٹسٹنٹ فرقہ نے بھی اپنا لیا - روسو بہت ہی پکا خدا پرست تھا - ایک مرتبہ ایک دعوت کے موقع پر کسی شخص نے ایسی بات کہہ دی جس سے خدا کے وجود کے بارے میں شک کا اظہار ہوتا تھا اس پر روسو فوراً دعوت چھوڑ کر چلے جانے کے لیے تیار ہو گیا -

والٹائر بھی اسی دور کا فلسفی تھا - وہ کہتا ہے:

"اگر خدا نہیں ہے تب بھی اس کو فرض کیے بغیر کام نہیں چل سکتا"

رسل لکھتا ہے کہ ہیگل بھی خدا کو مانتا ہے البتہ اس کا تصور خدا ارسطو کے تصور خدا کی طرح ہے۔ رسل نے ارسطو کا تصورِ خدا یہ بیان کیا ہے:

"تمام جاندار کم یا زیادہ درجہ میں خدا کی موجودگی کو ضرور محسوس کرتے ہیں اور ان میں خدا کے چاہنے اور اس سے محبت کرنے کی وجہ سے ہی حرکت پیدا ہوتی ہے - پس سب حرکات کا اصل منبع خدا ہے - اور تمام جانداروں کے افعال کا فاعلِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے"۔

رسل نے ایک امریکی فلاسفر سینٹانا کا بھی ذکر کیا ہے جو مذہب کو بہت چاہتا تھا - رسل لکھتا ہے:

"جب وہ خدا پر یقین رکھتا ہے تو بالکل ایسے جیسے وہ روزویلٹ یا چرچل یا ہٹلر کی حقیقت اور وجود پر یقین رکھتا ہے - اس کے نزدیک خدا بھی ایسی ہی حقیقی چیز ہے نہ کہ محض ایک نظریہ جس کے اچھے اثرات ہوتے ہوں"

آخر میں ایک جگہ رسل لکھتا ہے

"میں خود تو اس پر یقین نہیں رکھتا کہ فلسفہ مذہب کے اصولوں کو صحیح ثابت کر سکتا ہے یا ان کو غلط ثابت کر سکتا ہے"

مگر افلاطون کے وقت سے لے کر آج تک اکثر فلسفیوں نے اس بات کو اپنے کام کا ایک لازمی حصہ ضرور سمجھا ہے کہ وہ انسان کے مرکز جی اٹھنے اور خدا کے ثبوت کے لیے دلائل مہیا کرتے رہیں - حقیقت یہ ہے کہ معدودے چند کو چھوڑ کر بیشتر سائنسدانوں اور فلسفیوں نے وجود باری تعالیٰ کے بارے میں نئے سے نئے دلائل مہیا کیے ہیں اور اب جدید عصری تحقیقات اور نئی طبیعیات نے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے سائنس کو ہی خدا کے سامنے سربسجود کر دیا ہے -

اس طرح برٹرینڈ رسل نے اپنے علمی مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ تمام قابلِ ذکر سائنسدان اور فلسفی خدا کے وجود کے قائل رہے ہیں اور یہ ایک غیر سائنٹفک بات ہے کہ خدا کے وجود سے انکار کیا جائے -

فلاح و خسران کا دینی تصوّر

سیّد محمد صمیم پاشا - ایم - اے (سیاسیات) سال آخر، کراچی یونیورسٹی

ذاتی اغراض اور گروہی مفادات سے بلند ہو کر اعلیٰ نصب العین اور سارفیع منازل کی جانب بڑھنے والی تحریکوں کے لیے طویل اور مسلسل جدوجہد ضروری ہوا کرتی ہے۔ ایسی تحریکوں کے لیے اپنے مقصد سے گہرا لگاؤ اور اپنے نصب العین کے ساتھ کامل اخلاص ہی زادِ راہ بنتا ہے۔ آزمائش کے شدید ترین مراحل میں اور مصائب کی دشوار ترین گھاٹیوں سے گزرتے ہوئے بھی یہ تحریکیں اپنی منزل کو اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔ خوف یا لالچ سے مرعوب ہو کر اپنے نصب العین سے اِغماض برتنا اُن کے نزدیک ہلاکت ہے اور اُصولوں سے انحراف نہ کرتے ہوئے بڑی سے بڑی قربانی دے جانا اُن کے لیے عین سعادت۔

کرۂ ارض پر انسانوں کا سب سے زیادہ ہمدرد اور ان کی خیر و فلاح کا خواہشمند انبیاء علیہم السّلام کا گروہ تھا۔ لیکن نوح علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک انبیاء علیہم السّلام کی پوری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ انسانیت کے اِن محسنوں کی قیادت میں برپا ہونے والی تحریکوں نے شاذ ہی دنیوی غلبہ حاصل کیا ہے۔ کلام اللہ ایک جانب تو یہ بتاتا ہے کہ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا - "ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیجا ہے"۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ - "(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم تم سے پہلے بہت سی گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں" ——— لیکن دوسری طرف یہی قرآن بار بار اِدھر اُدھر انسانوں کی بدقسمتی کا تذکرہ یوں کرتا ہے کہ وَمَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ - "کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُن کے پاس کوئی رسول آیا ہو اور انہوں نے اُس کا مذاق نہ اڑایا ہو" وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ - "تم سے پہلے بہت سے رسولوں کا مذاق اُڑایا گیا ہے"۔ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ - "تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں"۔

خدائے حکیم وعلیم کی دعوت میں نہ لچک تھی نہ لوچ تھا، نہ ابہام۔ انبیاء علیہم السلام نے بھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں نعوذ باللہ کبھی کسی مداہنت اور تساہل سے کام نہ لیا۔ ایک نہیں کئی طریقے لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے اختیار کیے گئے۔ پیار و محبت سے راغب کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ دلائلِ عقلیہ اور براہین و بیّنات سے سمجھایا بھی گیا۔ تنبیہ اور انذار سے چونکایا بھی گیا۔ اور خدا کی مغضوب و مُعَذّب قوموں کے انجام سے عبرت بھی دلائی گئی۔ لیکن اسلام کی دعوت ہمیشہ ہر حال میں کفر کے ساتھ مصالحت کے ہر شائبے سے پاک رہی۔

اس جد و جہد کی طوالت کا اندازہ لگانا ہمارے لیے مشکل ہے۔ بعض انبیاء علیہم السلام کی عمریں تو صدیوں پر محیط تھیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ دعوت حق پر لبیک کہنے والوں کی تعداد کبھی تو اتنی رہی کہ انگلیوں پر گن لی جائے تو کبھی اتنی کہ نبیؐ کے تمام ہی پیرو ایک ہی کشتی میں سما جائیں؛ حد تو یہ ہے کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ قیامت میں ہر نبی اپنی اُمت کے ساتھ اُٹھے گا اور بعض نبیوں کی اُمت میں صرف ایک ہی پیرو ہوگا۔

غور و فکر کے دائرے کو ذرا اور وسعت دیجیے۔ قرآن کریم میں ایسے کتنے انبیاءؑ کا ذکر ہے جو اللہ کے قانون کو اللہ ہی کی زمین پر غالب کرنے کے لیے مقامِ اقتدار تک پہنچ سکے؟ انگلیوں پر گننے کی ضرورت بھی تو نہیں۔ حضرت داودؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت یوسفؑ اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کے علاوہ بھی کوئی اور؟ مگر دوسری طرف اُن کا کوئی شمار بھی ہے جن پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ گئے، جنھیں سنگسار کر دیا گیا، جن کے سر قلم کر دیے گئے، جن کے مبارک جسموں کو لوہے کے کنگھوں سے اُدھیڑا گیا، جنھیں اپنے وطن تک کو خیرباد کہنا پڑا؟ اور کیا یہ بھی حقیقت نہیں ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے اِنھی مقدس ہستیوں کے بارے میں فرمایا کہ "یہی ہیں محسنین"، "یہی ہیں فلاح پانے والے"، "انھی پر انعام کیا گیا"، "یہی کامیاب ہوئے"۔

فلاح و خُسران کا اپنا اپنا تصور ہے۔ گروہ، قبیلہ، علاقہ، وطن اور قوم کی بنیادوں پر سوچنے والوں کے نزدیک نفع اور نقصان کے پیمانے اور کامیابی و ناکامی کے معیارات بڑے ہی پست ہوتے ہیں۔ ان کی منفعت یہ ہے کہ معاشی و سیاسی قوت میں اضافہ کر لیا جائے۔ ان کے نزدیک فتح نام ہے دوسروں کو محکوم بنا لینے کا۔ وہ کامیابی اس کو سمجھتے ہیں کہ مسابقت کی دوڑ میں اوروں سے آگے نکل جائیں۔ لوٹ کھسوٹ، چالبازی، مکر و فریب اور سازشوں کے تانے بانے یہاں عین اخلاق ہیں۔ مسلّمہ قدروں اور حقیقتوں سے منحرف ہو جانا ان کے لیے کوئی بُرائی نہیں۔ اصول اور ضابطے راہ میں حائل ہوں تو یہ انھیں بے دریغ پامال کر دینے

کو بھی بالکل جائز سمجھتے ہیں۔ دوستی، رواداری اور اتحاد کے نعرے لگا کر بھی درحقیقت یہ سب ایک دوسرے کے حریف ہوتے ہیں۔!

لیکن وہ افراد یا وہ جماعتیں جو نفسانیت اور گروہ بندی کے تصور سے خالی ہو کر "رضائے الہٰی" کو اپنا نصب العین کہیں، خدا کے منشاء کو جو اپنی مرضی بنالیں، حق پرستی جن کا شعار ہو، وحی الہٰی جن کا معیار ہو، اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے میں جو اپنی سلامتی سمجھیں، جن کے پیش نظر نوع انسانی کی بھلائی ہو، جنہیں دلوں سے حسد و کینہ نکال کر اُن میں اخوت و محبت کی چاشنی پیدا کرنی مقصود ہو، جو نسل انسانی کے بکھرے ہوئے دانوں کو ایک تسبیح میں پرو دینے کے خواہاں ہوں، اُن کے نزدیک کامیابی اور ناکامی کا تصور بالکل ہی جدا ہوتا ہے۔ یہاں سود و زیاں کے کچھ دوسرے ہی پیمانے ہوں گے۔ مضرت و منفعت کی پڑتال کے لیے بھی کوئی اور ہی کسوٹی ملے گی۔

یہ ایک واضح سی بات ہے کہ مقصد کو پالینا اور منزل کو جا لینا کامیابی کی علامت ہوتا ہے اور اس کے برعکس مقصد کو اوجھل کر دینا اور منزل سے دور ہو جانا ناکامی پر دلالت کرتا ہے۔ تھوڑا سا غور کرنے پر ہم یہ بھی جان لیں گے کہ مقاصد اور نصب العین کی مختلف نوعیتوں ہی کی رعایت سے کامیابی اور ناکامی کے تصورات کا بھی تعین ہوتا ہے۔ مقصد سطحی ہوا تو دنیا ہی دار الجزاء ہے اور دنیوی متاع کو حاصل کر لینا ہی کامرانی ہے۔ برعکس اس کے نصب العین اگر زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہو تو اس دنیا کی حیثیت محض امتحان گاہ کی رہ جاتی ہے۔ اور اس راہ میں جان و مال کی قربانی دینا ہی عین مطلوب ہوتا ہے۔ خواہشات اور تمنائیں اگر پست ہوں تو نفع اور نقصان کے پیمانے بھی حقیر ہوں گے۔ برخلاف اس کے اغراض و مقاصد جس قدر بلند ہوں گے فلاح و خسران کے تصورات بھی اسی قدر ارفع ہوں گے۔ یہ سوال ہی سرے سے غلط ہے کہ اگر تم حق کے داعی ہو تو دنیا تمہارے قبضے میں کیوں نہ آئی؟ خام خیالی ہو گی اگر دنیوی منفعت کی میزان میں حق و ناحق کو تولنے کی کوشش کی گئی۔ مطلوب اگر اپنا ہی غلبہ ہو تو بے شک مقابل کو چت کر دینا ہی مفید سمجھا جائے گا۔ لیکن مقصود اگر حق کا غلبہ ہو تو تختۂ دار کو بڑھ کر چوم لینا بھی سعادت ٹھیرے گا۔ شہرت کا حصول ہی اگر مرکزِ خیال بن جائے تو دروغ گوئی کے لبادے کو اوڑھ لینے میں بھی کوئی حقارت نہیں۔ لیکن مقصود اگر سچائی کا فروغ ہے تو زہر کا پیالہ پی جانے میں بھی کوئی کراہت نہیں۔ جدوجہد اگر حق کے لیے ہے تو یہ دنیا کامیابی ناکامی کا پیمانہ بن ہی نہیں سکتی۔ نادانی ہو گی اگر کوئی تگ و دو تو ایسے نصب العین کے لیے کرے جو لافانی ہو

اور اس کا صلہ پانے کی توقع اس دنیا سے رکھے جو فانی ہے۔

پس آج بھی اور آئندہ بھی جو لوگ طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزمائی کا حوصلہ اپنے اندر پاتے ہوں انہیں میدانِ کشمکش میں اترنے سے پہلے فلاح و خسران کے حقیقی مفہوم یا بالفاظِ دیگر اس تصور سے خوب اچھی طرح آگاہی حاصل کر لینی چاہیے جو خدا اور انبیاء کرام علیہم السّلام نے پیش کیا ہے۔

جان لینا چاہیے کہ عین ممکن ہے دنیا کی مسرتوں اور لذتوں سے خدا کے باغی ہی لطف اندوز ہوتے رہیں لیکن رضائے الٰہی کے خواہشمندوں کے لیے یہ کوئی عجوبہ کی بات نہیں۔ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۔ " زمین پر خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے " زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۔ " کافروں کے لیے تو دنیا کی زندگی بڑی محبوب و دلپسند بنا دی گئی ہے۔" زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۔ لوگوں کی غلط فہمی کا عالم تو یہ ہے کہ وہ مرغوباتِ نفس، عورتوں، بچوں اور سونے چاندی کے ڈھیروں، مویشیوں اور کھیتوں ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں جبکہ حقیقت میں ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔ یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔" وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۔" اور دنیا کا سروسامان محض ایک دھوکا ہے۔"

ہو سکتا ہے کہ خدا کے صالح بندے دنیوی لحاظ سے تکالیف اور مشکلات میں گھرے ہوئے ہوں۔ مصائب کے پہاڑ ان پر ٹوٹ رہے ہوں لیکن پرہیزگاروں کے لیے یہ بھی کوئی رنج و ملال کا موقع نہیں۔ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۔ یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنہیں لوگوں کے درمیان گردش میں رکھا گیا ہے۔ إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ۔ بیقیناً متقیوں کے لیے کامرانی کا ایک مقام ہے۔ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۔ ایسے خدا ترسوں کو تو ابدی زندگی نصیب ہوگی۔ انصاف کا بھی تقاضا ہے کہ لازوال کام کے لیے محنت کرنے والوں کو صلہ بھی لازوال ہی عطا ہو۔ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۔ ایسے لوگوں کے لیے تو ان کے رب کے پاس دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

اور پھر سب سے بڑھ کر مومنوں کے اطمینان کے لیے تو یہی اطلاع کافی و شافی ہے کہ وہ جس راہ پہ گامزن ہیں وہی حق کا راستہ ہے۔ اللہ نے انہیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ یہی کیا کم مسرت کا مقام ہے

کہ اگر وہ خدا سے راضی ہو گئے ہیں تو خدا خود بھی ان سے راضی ہو گیا ہے ——— یہی فلاح اور کس شئے کا نام ہے؟

لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اگر رضائے الٰہی کا دعویٰ کیا ہے اور ابد الآباد کامرانی کے حاصل کر لینے کا شوق ہے تو قولی ہی نہیں عملی ثبوت بھی مہیا کرنے ہوں گے۔ قدم قدم پہ گواہی دینی پڑے گی ——— کیسی ہی قربانی کیوں نہ طلب کی جائے پیش کرنی ہوگی۔ چاہے وہ اپنے جگر گوشوں ہی کا معاملہ کیوں نہ ہو۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۔ "کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ کہ وہ بس اتنا کہنے ہی پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا"۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ ۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون لوگ وہ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔

ممکن ہے اس ساری بحث کے بعد کسی کے ذہن میں یہ سوال کلبلائے کہ خدا پرستوں کے لیے دنیا کی نعمتوں میں کوئی حصہ بھی نہیں؟ تو ہم پورے دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں بھی سچی کامیابی انہی لوگوں کا حصہ ہے۔ دنیا کا عالم تو یہ ہے کہ آج اگر کسی منادی کرنے والے کی تنبیہ پہ ناک بھوں چڑھاتی ہے تو کل ٹھوکر کھا کے جب سنبھلتی ہے تب اسی کو اپنا ہمدرد اور محسن بھی کہتی ہے۔

تاریخ ہی سے شہادت لو۔ حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کے معرکے کا کیا نتیجہ برآمد ہوا ——— یہی نا کہ حضرت ابراہیمؑ کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور نمرود کی فریب خوردہ آمریت کے پھریرے پھر بھی لہراتے رہے۔ لیکن بعد میں دنیا ہی نے کہا کہ حضرت ابراہیمؑ فلاح پا گئے اور نمرود خسارہ میں رہا۔ حضرت یحییٰؑ نے ساری زندگی شرم و حیا کی تعلیم و تلقین کی ——— کسی نے مان کر نہ دیا۔ رقاصہ کی فرمائش پہ آپ کا سر بھی قلم کر دیا گیا۔ مگر دھرتی نے حضرت یحییٰؑ ہی کو مصلح سمجھا اور رقاصہ اور اس کے ہم نشین ملعون ٹھہرائے گئے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قوم ہی کی غمگساری تو کی تھی مگر ظالم اپنے ہی زعم میں آپ کو سولی چڑھانے پر اتر آئے۔ لیکن جب وقت کے دھارے نے رخ پلٹا تو ساری دنیا ہی حضرت عیسیٰؑ کے گن گانے لگی۔

زمانہ گواہ ہے کہ انبیاءؑ، صدیقین، شہداء اور صالحین نے جس بات کا پیغام انسانیت کو دیا دنیا کے نزدیک حق قرار پا گیا۔ جو سیرتیں پیش کیں قیامت تک کے لیے وہی پاکیزہ نمونہ بن گئیں۔ جس کسوٹی سے

(باقی برصفحہ ۴۰)

فکر و عمل کی بیداری

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

بلاشبہ ایک بگڑے ہوئے معاشرے اور ایک اصلاحی تحریک کے درمیان میدانِ کشمکش ہر پہلو نوعیت کا ہوتا ہے۔ جہاں معاشرے کا بگاڑ ہمہ پہلو ہوتا ہے وہاں تحریک کے پاس بھی انسانی زندگی کے ہر پہلو کے لیے اصلاح کا ایک پروگرام ہوتا ہے جس کے نتیجے میں تحریک اور معاشرے کے درمیان اصلاح اور بگاڑ کی کشمکش کے سبب ایک ہمہ پہلو نوعیت کی مخالفت و مزاحمت برپا ہو جاتی ہے۔ معاشرے کے دروبست پر قابو یافتہ گروہ اپنی پوری توانائی اور بے جگری سے ہر اصلاح کا مقابلہ کرتے ہیں اور تحریک کو معاشرے میں نفوذ سے روکتے ہیں، اس لیے کہ اصلاح کا عمل معاشرے کے کسی گوشے میں بھی اگر پذیرائی حاصل کرلے تو پھر اُبلتے اور پھیلتے ہوئے چشمے کی طرح اس کی وسعت اور اثر پذیری کے آگے بند باندھنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔

کسی تحریک کے راستے میں مزاحمتوں کا ہونا ایک فطری امر ہے۔ مزاحمتیں اگر نہ بھی ہوں تو بھی یہ لازم نہیں ہے کہ ساری آبادی ہی اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ ہر معاشرے میں اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے رنگ برنگ کے لوگ پیدا ہوتے اور موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر تحریک ہر معاشرے میں سے اپنا حصہ پالیتی ہے۔ ہمیشہ کسی تحریک سے وہی لوگ دلچسپی رکھتے ہیں جنھیں اس کے اصولوں، پروگراموں اور طریقِ کار سے طبعی مناسبت ہوتی ہے۔ دوسرے عام لوگ غیر متاثر اور خاموش تماشائی بنے دُور دُور کھڑے رہتے ہیں اور تحریک کے صرف نتائجِ جدوجہد پر ہی نظر رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی تحریک سے الگ رہ کر اس کی راہ کی مشکلات سے پہلو بچاتے ہوئے فتح حاصل کرنے والے فریق کے حق میں زندہ باد کے نعرے لگا دینا اور شکست کھانے والے فریق پر لعنت و ملامت کے چند تیر برسا دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ چنانچہ تحریک کے عمومی مزاج سے عدم مطابقت رکھنے والے خاموش تماشائی لوگ یہ فریضہ سرانجام دینے سے کبھی نہیں چُوکتے۔ البتہ نتائج کی تمام تر ذمہ داری اس کے

قائدین کارکنان اور ہمدردوں پر ہی ہوتی ہے جو تحریک کی کشتی میں اپنی ساری متاعِ ہستی کے ساتھ سوار ہوتے ہیں اور ساحلِ مراد تک اس کی کامیابی کے ساتھ ساتھ تیرتے اور اس کی غرقابی کے ساتھ غرق ہوتے ہیں۔ تحریک کے نصب العین کو اپنا شعوری نصب العین بنا کر رضاکارانہ طور پر آئے ہوئے لوگ ہی دراصل اس تحریک کے جسم و جان ہوتے ہیں جن کی حرکت سے تحریک حرکت کرتی ہے اور جن کے جمود سے وہ جامد ہو جاتی ہے۔ یہی لوگ ہوتے ہیں جن کو فعال و متحرک رکھنے پر ہی تحریک کی حرکت و فعالیت کا دارومدار ہوتا ہے اور اگر وہ فعال و متحرک نہ رہ جائیں تو پھر ان کو فعال و متحرک کرنے سے زیادہ تحریک کے اندر اہم اور تعمیری کام اور کوئی نہیں ہوتا۔ دورِ حاضر کی اسلامی تحریک کے داعی محترم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے نہایت خوبصورتی سے اس نفسیاتی بات کو اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے۔

"انکشافِ حق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو اُس مقام پر ٹھہرنے نہیں دیتا جہاں وہ انکشاف سے پہلے تھا بلکہ وہ اسے کشاں کشاں اُس مقام کی طرف کھینچ لے جاتا ہے جدھر حق کی روشنی اُسے نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کسی تحریک کی صداقت کے معترف ہو کر اُسے قبول کرتے ہیں، ان کی زندگیوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ ان سے ایسی باتوں کا ظہور ہوتا ہے جن کی توقع عام حالات میں انسان سے نہیں کی جاتی۔ وہ اپنے اصول کی خاطر دوستیوں اور خونی و قلبی رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار، اپنی پوزیشن، اپنے منافع اور اپنی ہر چیز کا نقصان گوارا کرتے ہیں، حتٰی کہ قید و بند کی تکالیف اور موت کے خطرات تک سہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ پہلو ہوتا ہے کہ اُن کی عادات بدل جاتی ہیں، اُن کے خصائل میں تغیر آ جاتا ہے، یہاں تک کہ اُن کی شکل، صورت، لباس، خوراک اور عام طرزِ زندگی پر بھی اس کے اثرات اس قدر نمایاں ہوتے ہیں کہ گردوپیش کے لوگوں میں وہ اپنی ہر ادا سے الگ پہچان لیے جاتے ہیں۔ ہر شخص اُن کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ وہ جا رہے ہیں فلاں تحریک کے حامی"۔

فکر و عمل کی اس عظیم بیداری سے جو لوگ بہرہ ور ہوتے ہیں ان کی حرکت و فعالیت و کارکردگی میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے لوگوں کا گروہ ہی اپنی اجتماعی قوت و توانائی کے بل پر بڑے بڑے گروہوں پر غالب آ جایا کرتا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تبدیلی و تغیر اور اصلاح و انقلاب کا عمل ہمیشہ چھوٹے اور منظم گروہ ہی کے ہاتھوں بڑے اور غیر منظم گروہوں کے مقابلے میں، ان کی مزاحمت کے علی الرغم، بروئے کار آیا کرتا ہے۔

لیکن ایسے کسی چھوٹے اور منظم و فعال گروہ کو باطل قوتوں کے خلاف ایک مؤثر ہتھیار کی طرح استعمال کرنے

کا کام وہ قیادت کرتی ہے جو اس گروہ کو لے کر میدان جدوجہد میں اُترتی ہے۔ اس ساری کشمکش کی نہج اور اس کے نتائج کا دارومدار اُس قیادت کی حکمتِ عملی، بروقت فیصلوں، اور موزوں اور بھرپور اقدامات پر ہوا کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں آگے بڑھنے، کشمکش کرنے، اور باطل پر ضربِ کاری لگانے کے مواقع تو ظاہر ہے کہ کبھی کبھی ہی آتے ہیں اور اِن مواقع کو پہچان کر ان کو پیشانی کے بالوں سے پکڑنا اور ان سے فائدہ اُٹھانے کا کام کسی انقلابی گروہ کی قیادت ہی کرسکتی ہے۔ اگر وہ فعال، متحرک، بیدار مغز، دور بیں، نظریاتی اعتبار سے جرأت مند اور مُدبّر ہو تو جس طرح وہ دشمن کے ہر وار کو حکمت و تدبر سے روکتی ہے اسی طرح وقت آنے پر اس پر ایک ضربِ کاری لگا کر اس کی قوت میں کمی کرتی اور اسے پیچھے دھکیلنے کا کام بھی کرتی ہے۔ کسی گروہ کی کامیابی اور ناکامی، یا کامیابی کی منزل تک پہنچنے یا درمیانِ راہ میں منتشر ہوجانے کا بہت کچھ دارومدار اس کے رہنما اور قافلہ سالار پر ہی ہوتا ہے۔ کوئی قافلہ سالار بھی اس تاریخی ذمہ داری سے پہلو تہی نہیں کرسکتا کہ اس کی حیثیت گاڑی کے انجن کی ہوتی ہے۔ اس کی حرکت سے گاڑی حرکت میں رہتی ہے اور اس کے ٹھیر جانے سے گاڑی ٹھیر جاتی ہے اور اس کے رُخ بدلنے پر گاڑی رُخ بدل لیتی ہے۔ وہ آخری ذمہ داری اور تاریخی جوابدہی کے مقام پر ہوتا ہے۔ وقت گزرنے پر مشاورتیں، تجاویز اور مشیر سب تاریخ کے پس پردہ چلے جاتے ہیں اور کامیابی و ناکامی کی آخری ذمہ داری اسی شخص کے نام کے ساتھ وابستہ رہ جاتی ہے جو سب سے آگے کھڑا ہوتا ہے۔ وہ واقفِ راہ ہو تو راستے کھُلتے جاتے ہیں۔ وہ بھٹک جائے تو قافلہ بھٹک جاتا ہے۔ وہ جرأت و شجاعت کا پیکر ہو تو تنکے بھی بھالے بن جاتے ہیں۔ وہ مصلحت کوش ہو تو بہادر مردانِ کارزار بھی پہلو تہی کرنے لگتے ہیں۔ وہ مدبّر و نکتہ ور ہو تو اُلجھے ہوئے مسائل کی گتھیاں بھی سلجھتی چلی جاتی ہیں۔ وہ حکمتِ کار سے ناآشنا اور تدبّر و بصیرت سے بے بہرہ ہو تو سلجھے ہوئے سیدھے سادھے مسائل بھی اُلجھنے اور پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ غرض تاریخ کی شاہراہ پر راہنما افراد کے نشانِ قدم ہی پہچانے جاتے ہیں، عوام کی بھیڑ کے قدموں کی شناخت آخر کون کرتا ہے؟ جس گروہ کو فعّال قیادت مل جائے، اس کی کامیابی پر مبارکبادیاں اور اس کی خوش قسمتی کے تذکرے ہوتے ہیں اور جو گروہ بابصیرت اور فعال قیادت سے محروم رہے اس کے لیے بس اس کی ناکامی کے اسباب بیان کرنے والے ہی باقی رہ جاتے ہیں۔

تحریک کی قیادت کے لیے نصب العین اور طریق کار کے تعین و وضاحت کے بعد اپنی جدوجہد کے لیے ایک نقشۂ کار مرتب کرنا بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ وہ پروگرام جو تحریک کو عوام کے اندر نفوذ کے راستے پر ڈال دے، جو عوام کے دلوں کو جیت سکے، جو ان کے فہم کے قریب تر اور ان کی سمجھ کے عین مطابق ہو، جسے عوام

اپنی ضرورت محسوس کریں، اور پھر اس کے ساتھ اس پروگرام پر عمل پیرا گروہ کو بھی اسی طرح اپنی ذاتی ضرورت محسوس کریں۔ محض آفاقی تخیلاتی پروگرام جو معاشرے کی روزمرہ زندگی اور اس کی ضروریات سے ہم آہنگ نہ ہو کسی صورت بھی معاشرے کے اندر نفوذ کے راستے نہیں بنا سکتا۔ نفوذ کرنے والے پروگرام کو لازماً معاشرے کے جسم و رُوح دونوں کی بنیادی ضروریات کا کفیل بن کر سامنے آنا چاہیے۔

پروگرام کی نقشہ گری اور اس کے نفاذ کی تدابیر کے ساتھ ساتھ تحریک کا اجتماعی اور جماعتی تشخص بھی انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ یعنی لوگ اس پروگرام کے بارے میں کس گروہ پر بھروسہ کریں اور اس کے نفاذ کے لیے کن لوگوں کو آگے لائیں۔ اس پروگرام کا اس گروہ کے ساتھ مشخص و متعین ہونا انتہائی ضروری امر ہے۔ اس طرح کہ اس پروگرام کے ذریعے وہ تحریک سامنے آئے جو اس کی حامل ہے اور تحریک کے ذریعے وہ پروگرام سامنے آئے جو عوام کے مسائل کا حل ہے۔ چنانچہ جب لوگ اس پروگرام کو اپنے مسائل کا حل سمجھ کر اختیار کرنا چاہیں تو اس گروہ کے سوا دوسرے کسی گروہ کی طرف وہ نگاہ نہ کریں اور جب وہ اس گروہ کو مؤخر کریں (اس لیے کہ جمہوری جدوجہد میں انتخاب ہارنے والا ہر گروہ مؤخر ہی ہوتا ہے بالکل رد کبھی نہیں ہوتا) تو درحقیقت وہ اس پروگرام کو مؤخر کریں۔ تحریک اور اس کے پروگرام کا یہ تشخص ایسا بے آمیز اور غیر مشتبہ ہو کہ لوگ جانتے ہوں کہ جب فلاں پروگرام بروئے کار لانا ہوگا تو وہ فلاں گروہ کے ذریعے ہی بروئے کار لایا جائے گا۔ عوام کی نظروں میں تحریک اور اس کے پروگرام کی یہ حیثیت اسی صورت متعین اور مشخص ہو سکتی ہے اگر تحریک اپنی جدوجہد میں مستقل مزاج، بے لچک اور متواتر ثابت قدمی کا مظاہرہ کرے اور کبھی بھی کسی بے نظریہ گروہ کی سطح پر نہ اُترنے پائے۔ اس کا اپنا پلیٹ فارم معروف اور نمایاں ہو اور اس کی پالیسیاں اس کے نظریے کی بے لچک نمایندگی کرتی ہوں۔

اجتماعی اور نظریاتی تشخص کی امتیازی شان قائم رکھنے کے بعد اپنی طویل اور آخری منزلِ مقصود کے سفر کو مختلف منازلِ راہ میں تقسیم کرنے کا مسئلہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ جس طرح اگر ہم تاریخِ قرآن کی وادی میں داخل ہوں تو نظر آتا ہے کہ پہلے بھی اسلامی نظام تدریج و ترتیب کے ساتھ ہی نافذ ہوا تھا جو اصولی نصب العین کے ساتھ جزوی جدوجہد کے طریق کار کی طرف واضح اشارا کرتی ہے۔ چنانچہ اب بھی معاشرتی اور اخلاقی زندگی کے اندر اسلام کے احکام کو مختلف مدارج و مراحل میں نفاذ کے لیے منتخب کیا جائے اور اسلام کے نام لیوا حکمرانوں اور جمہوری اداروں کو ان کے نفاذ پر جمہوری طریقوں سے مجبور کیا جائے۔ اگر اسلام کی قانونی تعزیرات ملکی قوانین کی صورت

اختیار کرنے کے لیے اسمبلی کے پارلیمانی مراحل میں سے گزر کر ہی ملکی قانون کی صورت اختیار کریں گی تو ظاہر ہے کہ تشکیلِ قانون کی تدریج اور اس کے مدارج تو لازماً ملحوظ رکھے جائیں گے۔ پھر کیوں نہ شراب اور جوئے جیسی عوام کی نفرت کا نشانہ اور عام فہم برائیوں کو پہلے قدم پر بند کرانے کے لیے عوامی جدوجہد منظم کی جائے تاکہ ان محاذوں پر کامیابی حاصل کر کے کارکنوں کے اندر اُمید کی شمع روشن کی جائے اور ان کا اپنی جدوجہد پر اعتماد بحال ہو۔ اِسی طرح ایک کے بعد دوسری بُرائی کو نشانہ بنا کر ایک طرف اس کے خلاف اسمبلی میں قانون سازی کے لیے قانونی تجاویز پیش کی جائیں تو دوسری طرف اس کی تائید میں عوامی تحریک منظم کی جائے۔ اس طرح مرحلہ وار اور قدم بہ قدم تحریک کو اس کی حقیقی منزل کی طرف آگے بڑھایا جائے۔ اس طرح کے دو تین اقدامات سے ہی عوامی ریلہ اسلامی تحریک کی پشت پر اس طرح آجائے گا کہ پھر حکومت کے لیے ہر اصلاح کے آگے جھکنے یا پھر ملک کی باگ ڈور چھوڑ دینے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہ ہوگا اور ایک وقت لازماً آئے گا جب پوری شریعت کے نفاذ کی مہم آسانی سے منظم کی جاسکے گی اور اس کا راستہ روکنا کسی کے لیے بھی ممکن نہ ہوگا۔

کسی نظام کے نفاذ کے لیے جس نوعیت کی ملک گیر تحریک کی ضرورت ہوتی ہے وہ روزمرہ کے مروّج پروگراموں پر عمل پیرا ہونے سے کبھی رونما نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے شدید محنت اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے تحریک کے ایک ایک کارکن کو اپنا آرام و آسائش تج کر میدانِ عمل میں آنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ملک کے دعوتی میدان میں مرکزی مقامات سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی آبادیوں تک تحریک کی دعوت اور پروگرام پہنچانے کا ایک منصوبہ بند نظام ہو۔ معاشرے کے ہر طبقے اور ہر گوشے کو بیک وقت بات پہنچانے اور اسے حرکت میں لانے کے لیے ساری تحریک سارا زور لگائے یہاں تک کہ معاشرے کا وسیع بحر الکاہل حرکت میں آئے اور اس کے اندر اس کے ہر گوشے اور کونے میں تحریک کی بات نہ صرف پہنچ جائے بلکہ وہ بات لوگوں کی زبان پر بھی چڑھ جائے۔ لوگ اس کے بارے میں تذکرے کریں اور اپنی آرا کا اظہار کریں۔ پورا معاشرہ اس کے بارے میں دو کیمپوں میں تقسیم نظر آئے اور اس کے سامنے ایک فیصلہ کن مرحلہ آجائے۔ اس طرح تحریک کی دعوت بین فہم کے ذریعے جذبہ اور جوش اور جذبہ وجوش کے زور سے معاشرے کے جمود میں ایک بہاؤ کی کیفیت بھی پیدا ہو جائے جو افراد کو بہا کر اپنے ساتھ لے جائے اور وہ اپنی آزاد مرضی سے تحریک اور اس کے پروگرام کے حق میں فیصلے کے وقت اپنا فیصلہ دے دیں۔ جمہوری معاشروں میں رواں دواں تحریک کے ذریعے ذہنی بہاؤ پیدا کیے بغیر کوئی جمہوری تبدیلی لانا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ لیکن معاشرے میں دعوت کا دھارا چلا کر ذہنی بہاؤ پیدا کرنے کے لیے جس شدید محنت کی ضرورت ہے یہ کوئی آسان

کھیل نہیں ہے جو ٹھنڈے ٹھنڈے طریقے پر چند سیاسی اور انقلابی بیانات دینے سے کھیلا جاسکے۔ یہ کام پوری تحریک کی جان توڑ محنت چاہتا ہے۔ یہ وہ کوہ کنی ہے جس کے تصور سے ہی بڑے بڑے فرہادوں کا زہرہ آب آب ہوجاتا ہے اور جب تک کوئی تحریک اور اس کے کارکن یہ کوہ کنی نہ کریں نظامِ باطل کی پیدا کردہ مشکلات کے پہاڑوں کو کاٹ کر اسلام کے نظام کی شیریں نہر کو تراش کر لانا کسی صورت بھی ممکن نہیں ہے۔ نظامِ حق کو چلانے کی وہی لوگ صلاحیت ثابت کرسکتے ہیں جو اسے لانے کی مشکلات و مصائب کو بھی برداشت کرنے کا حوصلہ و ہمت رکھتے ہوں۔

سندھی اسلامی لٹریچر

ہم نے سندھی زبان میں اسلامی لٹریچر کی طباعت کا کام شروع کردیا ہے۔ درج ذیل کتب جو دعوتی اور تبلیغی کاموں کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں طبع ہوچکی ہیں۔

دینیات	۷/۵۰	مذہب جو انقلابی تصور	۱/۲۵
حقیقت صوم وصلوٰۃ	۳/-	حق جی گواهي	۲/۲۵
جہاد	۲/۷۵	سلامتی جو رستو	۱/۶۰
جہاد فی سبیل اللہ	۱/۵۰	داعیٔ اسلام جی حیات طیبہ	زیرِ طبع
دین فطرت	۱/۵۰	اسلام جو نظام حیات	″
حقیقت نبوت	۲/-	بگاڑ ۽ اُن جا اسباب	″
ایمان مفصل	۲/۵۰	اسلام موجودہ دور ۾	″
عبادت	۱/۵۰	مسلمان کنهن کي ٿا	″
دین ۽ شریعت	۲/-	چئون	
جماعت اسلامی تعارف ۽ خدمتون	۲/-	اسلام ڇا آهي	″

محمد شوکت۔ برائے فرقان پبلیکیشنز۔ ۲۶۶/ ۷/C لطیف آباد۔ حیدر آباد۔

شریعت و مصلحت

سید ریاض الحسن صاحب ایڈوکیٹ سپریم کورٹ

[مولانا محمد تقی امینی کی کتاب "احکامِ شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت" پر محققانہ تنقید]

مولانا محمد تقی امینی نے اپنی اِس کتاب کی عمارت تین بنیادوں پر اُستوار کی ہے۔

۱۔ شریعت ہر عہد اور ہر جگہ کے لیے ہمہ گیر نہیں ہے۔ شریعت نے کچھ باتوں کی تشریح کر دی ہے اور بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن کے متعلق کوئی تصریح نہیں کی۔ ایسی باتوں کے معاملہ میں انسان حالات و زمانہ کی مصلحت کے لحاظ سے قدم اُٹھانے کا مجاز ہے۔ مولانا نے اس بارے میں هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا الآیۃ اور مشہور فقہی قاعدہ الاصل فی الاشیاء اباحۃ سے استدلال کیا ہے۔ (ص ۱۱۴)

۲۔ جن اُمور کے بارے میں شریعت نے تصریح کر دی ہے اُن کے بھی اُصول بیان کیے ہیں نہ کہ فروع۔ تفصیلات اُن اصولوں کی روشنی میں حالات و زمانہ کی مصلحت کو مدّنظر رکھتے ہوئے مرتب کی جائیں گی۔

"اِس صورتِ حال سے نہ تکمیلِ ہدایت پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ قرآن حکیم کی جامعیت پر کسی قسم کی زد پڑتی ہے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو جامعیت اور تکمیل کی یہی صورت ممکن ہے نہ وہ جس کی نمائندگی عام طور پر ہو رہی ہے اور نتیجۃً الٰہی شریعت ایک خاص دور اور زمانہ میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ قرآن حکیم نے مالیات کی تنظیم و تقسیم کی کوئی خاص شکل و صورت متعین نہیں کی۔ صرف مقصد پر زور دیا ہے کہ اللہ کی مخلوق کو رزق حلال میسر ہو اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق عدل و انصاف کے ساتھ اس کی حاجتیں پوری ہوتی رہیں .... انفرادی و اجتماعی ملکیت کی بحث چونکہ طریق کار سے متعلق تھی جس میں حالات و زمانہ کی رعایت ناگزیر ہے اس بنا پر اس بحث کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ امانت و نیابت کا تصور دے کر ہمیشہ کے لیے اِس بحث کو ختم کر دیا ہے کہ ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ ہے اور انسان کو ساری چیزیں بطور امانت استعمال کے لیے دی گئی ہیں" (ص ۳۶ - ۳۷)

آگے چل کر " خاص شکل کے تعین سے ہر دور کی ضرورتیں نہیں پوری ہو سکتی ہیں " کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں :

"جب قوم طبقاتی کش مکش میں مبتلا ہو، سرمایہ ایک طبقہ میں سمٹ کر رہ گیا ہو، اور دوسرا طبقہ وسائلِ معاش سے محروم ہو کر نانِ جویں کا محتاج ہو، تو ایسی حالت میں عدل و توازن پیدا کرنے کے قوانین اُس وقت سے یقیناً مختلف ہوں گے جب کہ قوم خوشحال ہو اور معاشرتی عدمِ توازن محرومی کی حد تک نہ پہنچا ہو۔ ایسی صورت میں قرآن حکیم اگر تنظیم و تقسیم کے کسی ایک طریقہ کی نشان دہی کر دیتا یا مروجہ انفرادی و اجتماعی ملکیت کی بحث کو اُصولی اور بنیادی قرار دیتا تو اس کی عالمگیریت پر کس قدر زد پڑتی اور تکمیل ہدایت کی بات کس حد تک تشنہ رہ جاتی ؟" (ص ۳۹)

مزید فرماتے ہیں :

"موجودہ دور میں مسلم ممالک جن حالات سے دوچار ہیں اور طبقاتی کشمکش کی جس منزل پر پہنچے ہوئے ہیں ان میں مذہبی پلیٹ فارم سے انفرادی ملکیت کی آڑ میں سرمایہ داری و جاگیرداری نظام کی تائید و تبلیغ کی جاتی رہی تو لازمی طور سے وہ اشتراکیت کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے، جیسا کہ بعض ممالک میں ردِ عمل کے طور پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔"

" اگر وقت کی اِس ضرورت و نزاکت کو ملحوظ نہ رکھا گیا اور سرمایہ داری و جاگیرداری سے بدستور غذا اور تقویت حاصل کی جاتی رہی تو وہ دن دُور نہیں ہے کہ جو زبانیں آج انفرادی ملکیت کی آڑ میں سرمایہ داری و جاگیرداری کو " اسلامی " ثابت کر رہی ہیں کل وہی زبانیں اشتراکیت کو اسلامی ثابت کرنے میں پیش پیش ہوں گی"۔ (ص ۴۵)

۳ - جن اُمور سے متعلق شریعت میں نصوص وارد ہیں اُن میں بھی حالات و زمانہ کی مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔

اس امر کو ثابت کرنے کے لیے اپنی صاحب نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نظائر بیان کیے ہیں جن سے اُن کے کہنے کے مطابق ثابت ہوتا ہے کہ دونوں خلفاء نے حالات کی نزاکت کو پیش نظر رکھتے ہوئے نصوصِ شرعیہ کے خلاف عمل کیا۔ زیادہ تان اُنہوں نے حضرت عمرؓ پر توڑی ہے۔ اُن کے متعلق لکھتے ہیں :

" حضرت عمرؓ نے حکومت کی ترتیب و تنظیم کے سلسلے میں جتنے اقدامات کیے ہیں اُن سب کا احاطہ یہاں مقصود نہیں ہے۔ مؤرخین نے نہایت تفصیل سے ان کو بیان کر دیا ہے۔ ذیل میں چند وہ صورتیں ذکر کی جاتی ہیں جو انہوں

نے احکامِ شرعیہ میں حالات کی رعایت سے توسیعی پروگرام کے تحت اختیار کی تھیں اور بحیثیت مجموعی نصوصِ شرعیہ ان کے پیشِ نظر تھیں، اگرچہ ظاہرِ نظر میں کسی نص کی مخالفت معلوم ہوتی ہے یا صراحۃً ثبوت نہیں ملتا۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے یک وقت تین طلاقوں کو تین قرار دیا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ایک قرار دیتے تھے۔ تالیفِ قلوب کے لیے زکاۃ دینے کا ثبوت قرآن حکیم میں موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تالیفِ قلوب کے لیے کمزور ایمان والوں کو بکثرت زکوٰۃ دینا ثابت ہے، لیکن حضرت عمرؓ نے زکوٰۃ کے اس مصرف کو ختم کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجِ تمتّع کو مباح کیا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے اس کی مخالفت کر دی۔ اُمِّ ولد کی بیع جو کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں روا تھی حضرت عمرؓ نے اس سے مخالفت کر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں کے بارے میں فرمایا مسلمان پر اس کے غلام اور گھوڑے پر صدقہ نہیں ہے۔ لیکن اسلامی مملکت میں بسبب تجارت اور افزائشِ نسل کے لیے گھوڑوں کی کثرت ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے ان پر صدقہ مقرر کر دیا۔ نیز حضرت عمرؓ نے شرابی کی سزا اسّی کوڑے مقرر کی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سزا کی تعیین نہ تھی اور حضرت ابوبکرؓ نے چالیس کوڑے مقرر کیے تھے۔" (ص ۱۹۲ تا ص ۲۵۹)

امینی صاحب کے ان منصوبوں کا مقصد واضح طور پر یہ ہے کہ شریعت معاشرے کے تابع ہے اور جوں جوں معاشرہ بدلتا جائے گا شریعت کو بھی اس کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا ہوگا۔ یہ شریعت کا فرض ہے کہ وہ معاشرے میں زمان و مکان کے اختلاف کی وجہ سے ان ہونے والی تبدیلیوں کو پیشِ نظر رکھے اور ان کے مطابق ڈھل جائے۔ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ دنیا کے مختلف حصوں میں جو مختلف معاشرے ظہور پذیر ہیں ان میں شریعت کے احکام مختلف ہو جائیں گے اور اگر کوئی یہ پوچھے کہ فلاں معاملے میں شریعت کا کیا حکم ہے تو پہلے اس سے یہ معلوم کیا جائے گا کہ کونسی جگہ اور کون سے ملک میں اس کا جواب مطلوب ہے، تاکہ وہی حکم دیا جائے جو اس جگہ کے حالات کے مطابق ہو۔

نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام اور خلفائے راشدین نے جب دنیا کے سامنے اسلام پیش کیا اور اسے نافذ فرمایا تو اُن کو بھی مختلف قسم کے معاشرے درپیش تھے جن میں زمان و مکان دونوں لحاظ سے بہت بُعد پایا جاتا تھا۔ جگہ کے لحاظ سے تو ظاہر ہے کہ مختلف معاشروں کے مابین سینکڑوں اور ہزاروں میلوں کا فرق تھا اور وہ زندگی کے تمام شعبوں میں بالکل الگ تھلگ تھے۔ اور وقت کے لحاظ سے اس طرح مختلف تھے کہ مرورِ زمانہ سے یہی ہوتا ہے کہ معاشرہ ارتقاء کی منازل طے کرتا ہے۔ معاشروں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اُس کی وجہ یہی ہے کہ ایک معاشرہ دوسرے سے ارتقائی منازل میں پیچھے رہ جاتا ہے یا آگے نکل جاتا ہے۔ لہٰذا دو معاشروں کا مختلف ہونا ہی

اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اُن میں بُعدِ زمانی پایا جاتا ہے۔ اسی طرح جو معاشرے قرونِ اُولیٰ میں موجود تھے وہ جگہ کے لحاظ سے بھی اور زمانہ کے لحاظ سے بھی مختلف تھے۔ اس کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے مختلف المعاشرہ بستیوں اور علاقوں کے سامنے ایک ہی اسلام پیش کیا اور ہر جگہ ایک ہی شریعت کا نفاذ کیا۔

کیا موجودہ معاشرہ بہت مقدس ہے کہ اُس کو شریعت کے سانچہ میں ڈھالنے کے بجائے شریعت مُطہّرہ کو اُس کے مطابق تبدیل کر دیا جائے؟ امینی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کو ہر عہد و مقام پر پیش کرنے اور ہر زمانے اور ہر جگہ میں اُس کی طرف دعوت دینے کے بجائے تمام جاہلیتوں کے جواز کا فتویٰ دے دیا جائے، شریعت کو بازیچۂ اطفال بنا دیا جائے اور اس کی حیثیت ایک ایسی مُہر کی ہو جو ہر جاہلیت پر لگ سکے۔

یہ مسلک اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک کُھلی بغاوت، فساد فی سبیل اللہ اور روئے زمین پر اُلوہیت کا دعویٰ کر کے شرکِ عظیم کی طرف دعوت ہے۔ اور یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے۔ اسلام کی پچھلی چودہ سو سال کی تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ ہارون الرشید کو ابن المُقفّع نے اسی مسلک کی پیروی کا مشورہ دیا تھا، مگر اُس نے اسے قبول نہ کیا اور امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج کی صورت میں جو مشورہ اُسے دیا اُس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی۔ آئندہ صفحات میں امینی صاحب کے تینوں منصوبوں کا بالتفصیل اور مدلل رد کیا جائے گا اور اُنہی کے مطابق بحث کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے حصہ میں نقلِ صحیح اور عقلِ صریح سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شریعت ایک ہمہ گیر سرمایۂ حیات ہے جو پیدائش سے لے کر موت تک انسان کے ہر شعبۂ حیات پر محیط ہے۔ اس ضمن میں پانچ آیات قرآنی کی تفسیر اور پانچ احادیث کی تشریح کر کے امینی صاحب کو مسکت جوابات دیے گئے ہیں، اور مشہور فقہی قاعدہ الاصل فی الاشیاء الاباحۃ کی اصلیت و حقیقت کو واضح کر کے اس کی بنیاد پر اُٹھائی ہوئی عمارت کو منہدم کر دیا گیا ہے۔

دوسرے حصہ میں شریعت کے اصول و فروع کے باہمی ربط کی وضاحت کی گئی ہے اور فروع کی اہمیت کے عمرانی وجوہ بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح کر دی گئی ہے کہ شریعت اصول و فروع دونوں کے مجموعے کا نام ہے اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب و سنت کی صورت میں تمام اصول اور تمام فروع اُمت کے سپرد کر دیے ہیں۔ اس حصے میں اِس بات پر بھی تحقیق کی گئی ہے کہ حالات و زمانہ کی تبدیلی کی کیا حقیقت ہے اور شریعتِ حقّہ کے سرمدی اصول اور تفصیلی فروع کس طرح حالات و زمانہ کے تمام پہلوؤں کو اپنی آغوش میں

سمیٹ لیتے ہیں۔ اس حصہ میں اصولِ فقہ کے مشہور قواعد استحسان اور مصالح مُرسلہ کی صحیح تعبیر بھی دی گئی ہے، کیونکہ امینی صاحب نے ان قواعد کو غلط رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

تیسرے حصہ میں شیخین خصوصاً حضرت عمر فاروق رضؓ کے تعامل پر نقطۂ نظر کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ امینی صاحب نے حضرت عمرؓ کو ایک آمر کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اُن کی بحث پڑھ کر آدمی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضؓ ایک مطلق العنان اور جبّار فرمانروا تھے۔ وہ کتاب و سنت کو بھی جب چاہتے اپنی مرضی کے مطابق بدل دیتے تھے اور اُس وقت کے تمام مسلمان بشمول صحابہ کرامؓ اُن کے اِن تصرفات پر دم مارنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ یہ حضرت عمرؓ کی سیرت اور اسلامی تاریخ کے ایک درخشندہ باب کو مسخ کرنے والی بات ہے حالانکہ حضرت عمرؓ کتاب و سنت کے اتباع میں دوسروں سے زیادہ سخت تھے۔ اُن کا ہر فعل شورائی روایات کا آئینہ دار تھا۔ وہ خود بھی حق بات سننے کے لیے ہمیشہ ہمہ تن گوش رہتے تھے اور اس کے مطابق فوراً ڈھل جاتے تھے۔ نیز ان کے عہد کا معاشرہ ایسے جری اہلِ ایمان پر مشتمل تھا جن میں سے ایک بوڑھی عورت بھی خلیفۂ وقت کے سامنے حق گوئی و بیباکی کا ستون بن جاتی تھی۔

(بقیہ فلاح و خسران کا دینی تصوّر)

تم نیکی اور بدی میں تمیز کرتے ہو وہ انہی اللہ والوں کی تعلیم ہی کا تو دوسرا نام ہے۔!

اور دوسری طرف آثار و شواہد اس بات پر بھی گواہ ہیں کہ خدا کے منکروں نے اپنی زندگیوں میں کتنے ہی شیش محل کیوں نہ تعمیر کر لیے ہوں اور طاقت کے نشہ میں چور ہو کر اپنی ہی خدائی کے دعوے کیوں نہ کر بیٹھے ہوں لیکن آخر کار انجام ان کا بُرا ہی ہوا۔ آج وہی سب کے لیے باعثِ عبرت ہیں۔ اَذِلّہ کی مثال دینی ہو تو دنیا انہی کا نام پیش کرتی ہے!

فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ

رسائل و مسائل

عہدِ صدیقی اور دورِ عثمانی میں جمع قرآن

سوال :۔ ماہ ستمبر کے ترجمان القرآن میں رسائل و مسائل کا مطالعہ کر کے ایک شک میں پڑ گیا ہوں ۔ اُمید ہے آپ اسے رفع فرمائیں گے تاکہ سکون میسّر ہو۔

ردّو بدل' کی صریح مثال کے سلسلے میں آپ نے لکھا ہے کہ قرآن متفرق اشیاء پر لکھا ہوا تھا جو ایک تھیلے میں رکھی ہوئی تھیں ۔ حضورؐ نے اُسے سورتوں کی ترتیب کے ساتھ کہیں یکجا نہیں لکھوایا تھا ، اور یہ کہ جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ شہید ہو گئے تھے ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ :

کیا حفاظ اُسے کسی ترتیب سے یاد کرتے تھے یا بلا ترتیب ؟

کیا اس کی ترتیب حضرت صدیقؓ کے زمانے میں ہوئی ؟

اگر ترتیب وہی حضورؐ کی دی ہوئی تھی تو ردو بدل کیسے ہو گیا ؟

اللہ نے جو قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے وہ کیا ہے ؟

اسی طرح کمی" کی مثال میں کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا بعد میں اختلافِ قرأت کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کے زمانے میں صرف قریش کی زبان کی قرأت والا نسخہ محفوظ کر دیا گیا جو کہ اب تک رائج ہے اور باقی جلا ڈالے گئے ۔ تو کیا اللہ تعالیٰ نے باقی چھ حرفوں کی حفاظت نہیں کی اور انہیں ضائع ہو جانے دیا جب کہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے ؟

جواب :۔ رسائل و مسائل کی بحث کو پڑھنے سے آپ کے ذہن میں جو شکوک پیدا ہوئے ہیں وہ بآسانی رفع ہو سکتے ہیں اگر آپ حسبِ ذیل باتوں کو اچھی طرح سمجھ لیں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت قرآن پاک کو جس حالت میں چھوڑا

تھا وہ یہ تھی کہ اپنی مکمل اور مرتب صورت میں وہ صرف اُن حافظوں کے سینوں میں محفوظ تھا جنہوں نے حضورؐ سے سیکھ کر اُسے از اوّل تا آخر یاد کیا تھا۔ تحریری شکل میں آپؐ نے اُس کا لفظ لفظ لکھوا ضرور دیا تھا، مگر وہ متفرق پارچوں پر لکھا ہوا تھا جنہیں ایک مسلسل کتاب کی صورت میں مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ بعض صحابہؓ نے اس کے کچھ اجزا اپنے طور پر لکھ لیے تھے، مگر کسی کے پاس پورا قرآن لکھا ہوا نہ تھا۔ بہت سے لوگوں نے قرآن کے مختلف حصّے یاد بھی کر رکھے تھے، لیکن اُن اصحاب کی تعداد بہت کم تھی جنہیں حضورؐ کی سکھائی ہوئی ترتیب کے ساتھ پورا قرآن یاد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب حُفّاظ کی ایک اچھی خاصی تعداد لڑائیوں میں شہید ہو گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ اگر قرآن کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے اور اُمت کے پاس صرف متفرق حالت میں لکھا ہوا یا جزوی طور پر یاد کیا ہوا قرآن ہی رہ گیا تو اس کا بڑا حصّہ ضائع ہو جائے گا، کیونکہ وہ اپنی مکمل ترتیب کے ساتھ صرف ان حافظوں کے سینوں ہی میں محفوظ تھا۔

اس اندیشے کی بنا پر جب حضرت عمرؓ نے صدیق اکبرؓ کو پورا قرآن ایک مصحف کی شکل میں یکجا تحریر کرا دینے کا مشورہ دیا تو انہوں نے اوّل اوّل یہ شبہ ظاہر کیا کہ میں وہ کام کیسے کر سکتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا ہے۔ اور یہی شبہ حضرت زید بن ثابتؓ نے اُس وقت ظاہر کیا جب شیخینؓ نے انہیں جمعِ قرآن کی خدمت انجام دینے کے لیے کہا۔ دونوں بزرگوں کے شبہ کی بنیاد یہ تھی کہ قرآن کی حفاظت کے لیے حُفّاظ کے حفظ پر اعتماد فرمانا اور ایک مصحف کی شکل میں اُسے یکجا لکھوا دینے کا اہتمام نہ کرنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اب ہم اس سنت کو بدلنے کے کیسے مجاز ہو سکتے ہیں؟ مگر جس چیز نے بالآخر انہیں مطمئن کر دیا وہ حضرت عمرؓ کی یہ بات تھی کہ دین و ملت کی بھلائی اسی کام کو انجام دینے میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس بنیاد پر سنت سے ہٹ کر ایک کام کرنے کی شریعت کے اندر کوئی گنجائش نہ ہوتی تو صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ اسے جائز کیسے رکھ سکتے تھے، اور ساری اُمت اس کے صحیح ہونے پر متفق کیسے ہو سکتی تھی۔

میں نے اس معاملہ کو "ردّ و بدل" کی مثال اس معنی میں ہرگز قرار نہیں دیا کہ معاذ اللہ صدیق اکبرؓ اور ان کے رفقائے کار نے قرآن کے الفاظ یا اس کی ترتیب میں ردّ و بدل کر ڈالا تھا، بلکہ اس سے میرا مطلب وہی ہے جو حضرت عمرؓ کی تجویز پر خود صدیق اکبرؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کے ابتدائی جواب کا مطلب تھا۔

آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن دراصل تو قریش کی زبان میں نازل ہوا تھا، اور ابتدائی

حکم یہی تھا کہ اسی زبان میں اُس کو پڑھا اور پڑھایا جائے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کا وعدہ بھی اسی کے بارے میں تھا۔ لیکن ہجرت کے بعد حضورؐ کی درخواست پر قریش کی زبان کے علاوہ عرب کی دوسری چھ بڑی زبانوں میں اس لیے قرآن نازل کیا گیا کہ ملک کے مختلف حصوں میں اسلام قبول کرنے والوں کو اپنے اپنے علاقوں کے تلفّظ اور محاورے کے مطابق اسے پڑھنے میں سہولت ہو۔ یہ ایک رعایت تھی جو وقتی طور پر اشاعت قرآن میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے دی گئی تھی۔ اس کو ہمیشہ کے لیے برقرار رکھنا مقصود نہ تھا اور نہ اس کا منشا یہ تھا کہ قرآن عرب کی سات زبانوں میں دنیا تک پہنچایا جائے۔ لیکن بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ اُس زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو رعایت دی گئی تھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں آخر وقت تک باقی رہی اور اسے منسوخ کرنے کا کوئی حکم نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا اور نہ رسول اکرمؐ کی زبان مبارک سے سُنا گیا۔ اس رعایت کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُس وقت منسوخ کیا جب یہ دیکھا گیا کہ سات زبانوں میں قرآن مجید کی مختلف قرأتیں لوگوں کے لیے، اور خصوصاً غیر عرب نومسلموں کے لیے، سخت فتنے کی موجب بن گئی ہیں۔ اس لیے اُمت کو فتنے سے اور کتابِ الٰہی کو اختلاف سے محفوظ رکھنے کی خاطر امیرالمؤمنین نے فیصلہ کیا کہ صرف قریش کی زبان میں قرآنِ پاک کے نسخے لکھوا کر دنیائے اسلام کے مراکز میں پھیلا دیے جائیں اور وہ تمام نسخے جلا ڈالے جائیں جو دوسری چھ زبانوں کے مطابق لکھے گئے ہوں تاکہ کبھی کوئی دشمنِ دین قرآن میں شبہات پیدا کرنے کے لیے ان کو استعمال نہ کر سکے۔ ظاہر بات ہے کہ سات نازل شدہ حرفوں میں سے چھ کو منسوخ کر دینا ایک بہت بڑا اقدام تھا۔ اگر شریعت میں اس کی گنجائش نہ ہوتی تو نہ حضرت عثمانؓ ایسا اقدام کر سکتے تھے اور نہ پوری اُمت اسے قبول کر سکتی تھی۔

مطبوعات

آؤ مدینہ چلیں | مرتبہ: حافظ نذر احمد صاحب

ناشر: مسلم اکادمی، نذر منزل ۲۹/۱۸ محمد نگر علامہ اقبال روڈ۔ لاہور

صفحات: ۱۰۸ قیمت: -/۲ روپے

زیر نظر کتاب حجاز مقدس کے دس سفرناموں کا مجموعہ ہے جو کہ دس مختلف علماء اور مشاہیر نے قلمبند کیے تھے۔ ان مشاہیر میں دنیائے اسلام کی بعض نامور شخصیتیں بھی شامل ہیں، مثلاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، علامہ محمد اسد، مولینا عبدالماجد دریا آبادی، مولینا نعیم صدیقی۔ یوں تو بازار میں حجاز مقدس کے کئی ایک سفرنامے موجود ہیں لیکن اس سفرنامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قارئین کو ایک ہی مجموعہ میں اس مقدس سفر کے مختلف تاثرات یکجا مل سکتے ہیں۔ یہ کتاب حج اور عمرہ کرنے والوں کے لیے معلومات افزا ہے۔

کتاب کے شروع میں اُن تمام سفرناموں کا تعارف دے دیا گیا ہے جن میں سے اقتباسات لے کر یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے تاکہ قارئین اگر تفصیل سے مطالعہ کرنا چاہیں تو انہیں اصل کتب کی تلاش میں آسانی ہو۔

کتاب ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت اور طباعت مناسب ہے۔

اسلامی عینک | جناب زبیر حسن رضوی

ناشر: مکتبہ رازی ۱۱۶۰ - پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵

قیمت: درج نہیں

اس کتاب کے فاضل مصنف نے مختلف آیات قرآنی اور احادیث کو جس طرح سمجھا ہے اُن کی وضاحت اور تشریح اس کتاب میں کر دی ہے۔ مصنف کو خود اعتراف ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے (باقی بر صفحہ ۴۸)

(بقیہ اشارات) انجام ہوا۔ لیکن ان سب حقائق کے جاننے کے باوجود جو اُس کے سامنے سورج سے زیادہ روشن صورت میں موجود ہوتے ہیں وہ کوئی سبق حاصل نہیں کرتا۔ وہ مسندِ اقتدار پر بیٹھ کر ساری غرمنیاں اس باطل خیال کے تحت کرتا ہے کہ اگر دوسرے حکمرانوں کا اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے بُرا حشر ہوا ہے تو یہ بات صرف انہیں تک محدود ہے۔ اس کی ذات اپنی کوتاہیوں کے باوجود بُرے انجام سے بہرحال محفوظ رہے گی کیونکہ وہ جو ظلم اور زیادتی کر رہا ہے وہ قوم کی بہتری کے لیے کر رہا ہے اگر وہ عوام کے شہری حقوق سلب کرتا ہے تو اس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ عوام حقوق کے چکروں سے نکل کر فرائض کی انجام دہی میں منہمک ہو جائیں، اگر وہ جمہوریت کا گلا گھونٹ کر عوام پر آمریت مسلط کرتا ہے تو اس کی غرض بھی صرف یہی ہوتی ہے کہ قوم رائے عامہ کی تیاری اور انتخابی سرگرمیوں میں اپنے اوقات اور صلاحیتیں کھپانے کے بجائے انہیں ملکی تعمیر کی راہ پر لگائیں۔ وہ عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی جو نمائشی کاموں میں صرف کرتا ہے تو اس سے عوام کو برہم نہ ہونا چاہیے کیونکہ اس میں بھی اُس کے پیشِ نظر ملکی وقار کا مسئلہ ہوتا ہے کہ کہیں دوسری قومیں اُس کے بارے میں یہ غلط تاثر قائم نہ کر لیں کہ وہ ایک غریب قوم کا غریب سربراہ ہے۔ اس ظالم اور ناانصاف حکمران کی عیارانہ باتیں ممکن ہے اقتدار کی مستی کی وجہ سے خود اُسے فریبِ نفس میں گرفتار کر دیں مگر دوسروں کے لیے یہ کسی اعتبار سے بھی قابلِ اطمینان نہیں ہوتیں۔ بداعمالیوں اور دراز دستیوں کے حق میں یہ بھونڈے دلائل جابر حکمرانوں کے وقار کو سخت مجروح کرتے ہیں اور ملک کے اندر اور باہر اُن کے بارے میں یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ یہ حکمران نہ صرف سفاک، مردم آزار اور غیر مخلص ہیں بلکہ عقل و خرد سے بھی یکسر عاری ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ تختِ اقتدار پر بیٹھ کر اس طرح کی احمقانہ حرکتیں کرنے والے اپنی ان حرکات کے ردِّعمل اور اس سے پیدا ہونے والے تباہ کن نتائج سے بے پروا ہی رہتے ہیں اور ان پر اس وقت تک مدہوشی طاری رہتی ہے جب تک یہ تخت و تاج سے محروم نہیں ہو جاتے۔ اگر مسندِ اقتدار پر فائز رہتے ہوئے کوئی صاحبِ اختیار اپنے اعمال اور اس کے نتائج کو جانچنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ رہے تو اس سے انسانیت بے شمار ہلاکتوں سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ انسانیت کی یہ مخلصانہ آرزو، کہ جو سر تاج سے مزین ہے اس میں خود پسندی کا خناس موجود نہ ہو، آرزو ہی رہی ہے اور بہت کم صورتوں میں شرمندۂ تعبیر ہو سکی ہے۔ اگر انسانیت

کی یہ آرزو پوری ہو جاتی تو انسانی زندگی میں جبر و استبداد کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔ مسندِ عدل پر بیٹھ کر تو لوگوں نے انصاف کیا ہے لیکن تختِ اقتدار پر براجمان ہو کر اصحابِ اقتدار نے عوام کے ساتھ بالعموم ظلم اور زیادتی ہی کی ہے۔

تاریخ کا تیسرا بڑا المیہ یہ ہے جو طالع آزما عوام پر اپنی خدائی کے قیام کی خاطر حصولِ اقتدار کے لیے کوشاں ہوتے ہیں، وہ کسی مرحلے پر بھی کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس سے ملک و ملت کو حقیقی فائدہ حاصل ہو۔ لیکن وہ اپنی چالاکی اور عیاری سے تختِ اقتدار پر قابض ہونے سے پیشتر عوام کو یہی تاثر دیتے ہیں کہ اُن سے زیادہ ملک و ملت کا کوئی خیر خواہ نہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کے تخت نشین ہونے سے پہلے ہی قوم پریشان فکری، پریشان نظری اور ابلہ فریبی کا شکار رہتی ہے اور بعد میں جبر و استبداد کی چکی میں پسنے کے علاوہ یاس و قنوطیت جیسے مہلک امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شخص یا گروہ قوم کے سامنے ٹھوس اور قابلِ تکمیل منصوبے پیش کر کے اُسے اپنے پیچھے لگائے تو اس کا یہ طرزِ عمل جہاں ایک طرف اس کے خلوص کو ظاہر کرتا ہے وہاں عوام کو بعد ازاں مایوس ہونے سے بھی بچاتا ہے۔ لیکن اگر اقتدار کا کوئی حریص قوم کے سامنے سپنوں کے محلات تعمیر کر کے اسے گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ ملک و ملت کی انتہائی بدنصیبی ہے کیونکہ عملی زندگی میں جب یہ طلسمات ٹوٹتے ہیں تو قوم پر افسردگی کا عالم طاری ہونے کے ساتھ اس کی ساری اصلی صلاحیتیں بھی ٹھٹھک کر رہ جاتی ہیں اور قوم کی حالت اُس حرماں نصیب باپ کی سی ہوتی ہے جو خود اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی اُمیدوں کے پیکر کو مرقد کے سپرد ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔

دُور نہ جائیے موجودہ حکمران جماعت اور اُس کے سربراہ کی تخت نشینی سے پہلے کی کارگزاریوں پر ایک نگاہ ڈال لیجیے تو آپ کو اس المیے، جسے قنوطیت کا المیہ کہا جا سکتا ہے، کی شدت کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ قوم کی تعمیر کے لیے فکری یکسوئی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے کسی قوم کا حقیقی بہی خواہ سب سے پہلے اس بات کی فکر کرتا ہے کہ قوم کو فکری انتشار سے بچا کر اُسے نصب العین کے معاملے میں یکسو کیا جائے لیکن یہاں چونکہ اصل مقصد جائز و ناجائز طریق سے اس کی گردن پر مسلط ہونا تھا اس لیے اس کے اندر فکر و نظر کا خوفناک انتشار پیدا کیا گیا اور وہ بیچاری اگر پہلے اپنے بعض مقاصد کے معاملے میں یکسو بھی تھی تو اس یکسوئی

کو توڑ کر اُسے نصب العین کے بارے میں بے راہ رو بنایا گیا۔ پیپلز پارٹی کا دلپسند نعرہ: اسلام ہمارا دین ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے اور اشتراکیت ہماری معیشت ہے، پریشان فکری کے علاوہ اور کس چیز پر دلالت کرتا ہے۔ اس نعرے میں "اسلام ہمارا دین ہے" کو اس لیے شامل کیا گیا کہ پاکستان کے اندر خالص الحاد کی کوئی دعوت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس جزو کا مقصد صرف اسی قدر تھا کہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو اپنے ساتھ شامل کیا جائے۔ ہمارے ملک کے سابق فرمانرواؤں کی پیہم غلطیوں کی وجہ سے چونکہ اشتراکیوں کو جدید تعلیم یافتہ حلقوں کے اندر نفوذ کے راستے میسر آ چکے تھے اور اس بنا پر وہ بڑے جارحانہ انداز میں بعض طبقوں کے اندر سوشلزم کا پرچار کرنے میں مصروف تھے، اس لیے اُن کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی غرض سے اشتراکیت ہماری معیشت کی صدا بلند کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملحدانہ افکار و نظریات رکھنے والے افراد جو برسوں کی سر توڑ کوششوں کے باوجود مسلم معاشرے میں عزت و احترام کا کوئی مقام حاصل نہ کر سکے تھے، وہ دیکھتے دیکھتے اس "سہ رنگی" جماعت کے قائدین بن گئے۔ پھر جب مسلم طبقوں کی طرف سے اس اجتماع نقیضین پر اعتراض کیا گیا تو عوام کو دھوکہ دینے کی غرض سے یہ کہا جانے لگا کہ اشتراکیت سے ہماری مراد اسلامی اشتراکیت ہے اور یہ اصطلاح مساوات محمدی کے ہم معنی ہے۔ یہ اور اس نوعیت کی دوسری فریب کاریوں سے حصولِ اقتدار کا مقصد تو بلاشبہ حل ہو گیا لیکن اس سے قوم کو جو عظیم نقصان پہنچا ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستانی قوم جس کی بہت بڑی اکثریت اسلامی نظام کے قیام کو اپنا واحد نصب العین قرار دے چکی تھی اور جس کی خاطر اس نے آگ اور خون کے سمندر میں سے گزرنا گوارا کیا تھا اور پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد بھی اُس نے نصب العین سے انحراف کی ہر کوشش کو پوری قوت کے ساتھ روکنے کی کوشش کی تھی، اس نصب العین ہی کے بارے میں پریشان فکری کا شکار ہو گئی اور جو کام اس ملک کے سوشلسٹ، کمیونسٹ اور دوسرے ملحد عناصر برسوں کی تگ و دو کے بعد بھی کرنے میں ناکام رہے تھے وہ پیپلز پارٹی کی گمراہ کن نعرہ بازی کی وجہ سے بڑی تیزی کے ساتھ سرانجام پا گئے۔

حصولِ اقتدار کی جدوجہد تک تو یہ متضاد عناصر وسیع اختلافات کے باوجود حکمرانی کے لالچ میں ایک دوسرے کے ہمرکاب رہے مگر جب حکومت پر قبضہ ہو گیا تو اُن میں سے ہر عنصر نے نہایت بلند آواز میں اپنی اپنی بولی بولنا شروع کی اور ذاتی مفادات اور گروہی تعصبات اور نظریاتی تقاضوں کو سامنے رکھ کر

اُمورِ مملکت کو چلانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے، چنانچہ چند ماہ بھی گزرنے نہ پائے کہ زندگی کے ہر شعبے میں شدید انتشار رونما ہوا جس کے نہایت رُوح فرسا اور بھیانک مناظر آج جگہ جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں اس وقت اُمورِ مملکت کی باگ ڈور ہے وہ افراتفری کے اس عالم کو اپنے حق میں مفید سمجھتا ہو اور اس انداز پر سوچ رہا ہو کہ مختلف طبقوں کی باہمی آویزش اور سر پھٹول اس کے عہد اقتدار کو طول دے سکتی ہے لیکن اسے اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیے کہ کسی ملک میں انارکی کا وجود اُس ملک کی آزادی کے لیے شدید خطرے کا باعث ہوتا ہے۔

(بقیہ مطبوعات)

اُن میں سے کوئی چیز بھی اُن کے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفہیم القرآن کی مختلف جلدوں کے مطالعہ سے جو کچھ انہوں نے اخذ کیا ہے اسے مختصراً اپنی زبان میں بیان کر دیا ہے۔ کتاب میں مختلف آیات قرآنی کے جو تراجم درج کیے گئے وہ بھی تفہیم القرآن سے نقل کیے گئے۔

کتاب عام مسلمانوں بالخصوص نوجوان طلباء کے لیے مفید ہے اور تفہیم القرآن کے بالاستیعاب مطالعہ تمہید بن سکتی ہے۔

کتابت اور طباعت گوارا ہے۔

دورِ جدید کے مسائل اور اُن کا اسلامی حل

سمجھنے کیلیے

عظیم لٹریچر

تفہیمات حصّہ اوّل	ابوالاعلیٰ مودودی	۲۲/- روپیہ
" حصّہ دوم	"	۲۷/- "
" حصّہ سوم	"	۱۴/۵۰ "
تنقیحات	"	۱۱/- "
اسلام اور ضبطِ ولادت	"	۷/۲۵ "
تنقیدات	امین احسن اصلاحی	۷/- "
توضیحات	"	۷/۷۵ "
اساس دین کی تعمیر	صدر الدین اصلاحی	۱۲/- "
اسلام اور اجتماعیت	"	۸/- "
دین کا قرآنی تصوّر	"	۵/۷۵ "
فریضہ اقامت دین	"	۷/- "
حقیقت عبودیت	"	۳/۷۵ "
اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو	ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی	۱۲/۵۰ "
نظامِ اسلامی مشاہیر کی نظر میں	خلیل احمد حامدی	۶/۵۰ "
جہادِ اسلامی	"	۵/۵۰ "

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۔ ۱۳۔ ای شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور (فون نمبر ۶۸۳۴۱)

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

اَلْجِهَادُ فِی الْاِسْلَام

سید ابو الاعلیٰ مودودی کی اوّلین تصنیف

— جو ۲۳ سال کی عمر میں تحریر کی گئی

— جس کی علامہ اقبالؒ نے بھی تعریف و تحسین فرمائی۔

— جسے تحریکِ قیامِ پاکستان کے دوران میں مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لیے کثیر تعداد میں پھیلایا گیا۔

— اسلام کے نظریۂ جہاد اور قانونِ صلح و جنگ کی بہترین اور مکمل تصویر۔

— دیگر مذاہب و اقوامِ عالم کے جنگی مقاصد و نظریات

اور

بین الاقوامی قوانینِ قتال کا تقابلی مطالعہ

— اسلامی قواعدِ جہاد کی برتری کے تفصیلی دلائل۔

— جہاد کے مخالفین و معترضین کا مسکت جواب

درجنوں کتب و دستاویزات کے مطالعہ کا نچوڑ